رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ جلد ۳۶ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ-لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards Understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism What ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

(Pakistan)

ترجمان القرآن لاہور

جلد ۳۷ | جمادی الاوّل سنہ ۱۳۷۱ھ مطابق فروری سنہ ۱۹۵۲ء | عدد ۵

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

اِشارات

پچھلے دنوں صوبہ سرحد کے دورے کے سلسلے میں پارہ چنار کے مقام پر ایک صاحب نے مجھے ایک رقعہ دیا تھا جس میں میری کتاب "حقوق الزوجین" کے ایک مقام کی غلطی پر انہوں نے مجھے متنبہ فرمایا تھا۔ میں نے دورے سے واپس آکر اس مقام کو دیکھا اور احکام القرآن للجصاص کی اصل عبارت سے، جس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے وہ مسئلہ لکھا تھا، اس کا مقابلہ کیا۔ معلوم ہوا کہ فی الواقع اس جگہ مجھ سے غلطی سرزد ہوگئی ہے، اور احکام القرآن کی عبارت کا وہ منشا نہیں ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ میں نے حقوق الزوجین کے نئے ایڈیشن میں، جو زیر طبع ہے، اس مقام کی اصلاح کر دی ہے۔ جن اصحاب کے پاس اس کتاب کے پرانے ایڈیشن ہیں وہ بھی اپنے اپنے نسخوں میں اصلاح فرمالیں۔ اللہ تعالیٰ اُن صاحب کو جزائے خیر دے جنہوں نے میری اصلاح کی کوشش فرمائی۔

یہ مقام "ایلاء" کی بحث میں ملیگا۔ مطبوعہ عبارت یہ ہے:۔

"صحابۂ کرام میں سے جو لوگ تفقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے، مثلاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ان کی رائے اس باب میں یہی تھی کہ ضرار کی نیت سے عورت کو چھوڑ دینا ایلاء ہے، خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو۔"

اس عبارت کے نیچے حاشیہ میں احکام القرآن للجصاص کا حوالہ ہے۔ اس پوری عبارت کو حاشیہ سمیت حذف کر دیا جائے، اور اس کی جگہ حسب ذیل عبارت لکھ دی جائے:۔

"اس معاملہ میں امام مالکؒ کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر بیوی کو تکلیف دینے کی نیت سے ترک مباشرت کرے تو اس پر بھی ایلاء ہی کا حکم لگایا جائیگا، اگرچہ اُس نے قسم نہ کھائی ہو۔ کیونکہ ایلاء پر پابندی عائد کرنے سے شارع کا مقصود ضرار کو روکنا ہے، اور یہ علت اُس ترک مباشرت میں بھی پائی جاتی ہے جو حلف کے بغیر

یہ قصد ضرار کیا جائے "

حاشیے میں احکام القرآن لابن عربی جلد اول صفحہ ۷۵ ، اور بدایۃ المجتہد لابن رشد جلد دوم صفحہ
کا حوالہ درج کر دیا جائے ۔

پاکستان میں قانون سازی کا رجحان جس سمت کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے وہ اب ہر اُس شخص کے لیے باعثِ تشویش بن گیا ہے جو حق اور انصاف کو عزیز رکھتا ہے ، اور اس ملک کی خیر چاہتا ہے ۔ اگر مسلمان کی نظر سے دیکھا جائے تو قانون کی صحت کا معیار وہ اصول ہیں جو اسلام نے ہم کو دیے ہیں ۔ اور اگر نامسلمان کی نظر سے دیکھا جائے تو بھی قانون کی صحت کا معیار وہ عقلِ عام ہے جو انصاف کے چند معروف اور عالمگیر اصولوں کو سچا مانتی اور سمجھتی ہے لیکن ہمارے ہاں جس قسم کے قوانین بن رہے ہیں (خواہ وہ مجالس قانون ساز کی معرفت بنے ہوں یا "فرمانوں" کے ذریعہ سے ملک پر مسلط کیے گئے ہوں) اُن کو دیکھیے تو وہ نہ اسلام ہی کے اصولوں پر پورے اترتے ہیں اور نہ انصاف کے اُن معروف اصولوں پر جنہیں عقلِ عام جانتی ہے ۔ اس رفتار کو روکنا سخت ضروری ہے قبل اس کے کہ یہ فتنے اور خطرے کی انتہا تک پہنچے ۔

اس سلسلے میں ہم اُن چند نمایاں خصوصیات کا جائزہ لیں گے جو پنجاب کی مجلس قانون ساز کے منظور کردہ قوانین اور مرکزی حکومت کے نافذ کردہ فرمانوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں ۔

ان کی پہلی نمایاں اور سخت مکروہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایسا قانون ، جس میں نظم و نسق اور اس کے کارپردازوں کو عوام الناس کے شخصی حقوق پر دست درازی کرنے کے غیر معمولی اختیارات دیے گئے ہیں ، ساتھ ساتھ بالالتزام ایک دفعہ اس مضمون کی بھی رکھتا ہے جس میں تصریح کر دی گئی ہے کہ ملک کی عام عدالتیں ان اختیارات کے استعمال سے متعلق لوگوں کی کسی شکایت کی نہ سماعت کر سکتی ہیں ، نہ ان پر کوئی فیصلہ دے سکتی ہیں ۔ ہم نے دقتِ نظر سے جائزہ لے کر دیکھا اور اس خصوصیت سے کسی قانون اور کسی آرڈی نینس کو خالی نہ پایا ۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے منتظمینِ حکومت نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے؟ اگر یہ اسلام سے ماخوذ ہے تو ہم بڑے شکر گزار ہونگے اگر قرآن و حدیث کے اُن ارشادات کی نشان دہی کر دی جائے جن سے یہ اصول اخذ کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ عقلِ عام سے ماخوذ ہے تو ذرا ہمارے اربابِ حکومت وہ دلائل ارشاد فرمائیں جو اس اصول کی تائید میں ان کے پاس موجود ہیں، تاکہ ہم بھی دیکھ سکیں کہ اس کا ماخذ واقعی عقلِ عام ہی ہے یا کوئی عقلِ خاص۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ منتظمینِ حکومت کو آخر اس پر اس قدر اصرار کیوں ہے کہ جو قانون بھی وہ بناتے ہیں اس میں لازماً اس مضمون کی ایک دفعہ رکھ دیتے ہیں؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کی عدالتیں ناقابلِ اعتماد ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو براہِ کرم پبلک کو بھی ایسی عدالتوں سے نجات دلائیے اور رخصت کیجیے ان سارے منصفوں اور مجسٹریٹوں کو۔ لیکن اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ باشندگانِ ملک کو اپنا مملوک سمجھتے ہیں اور وہ اختیارات چاہتے ہیں جو قدیم زمانے میں آقاؤں کو اپنے غلاموں پر حاصل تھے؟

دوسری نمایاں خصوصیت ان کے اندر یہ پائی جاتی ہے کہ جس معاملہ میں بھی حکومت اور پبلک کے درمیان نزاع کے عدالتی فیصلے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، اُس میں یہ ضرور تجویز کیا گیا ہے کہ عام ملکی عدالتوں کے بجائے خاص عدالتیں (ٹریبونل) اس کے لیے بنائی جائیں گی، جن کا تقرر ظاہر ہے کہ خود حکومت ہی کرے گی۔

غور کیجیے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مقدمے کا ایک فریق ہر اُس جج کے سامنے جانے کے لیے تیار نہیں ہے جو عام لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت کی کرسی پر بٹھایا گیا ہے، بلکہ اسے اس بات پر اصرار ہے کہ میں خود جس جج کا انتخاب کروں اس کے سامنے مقدمہ جائے، اور فریقِ ثانی اُسی کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو ——— سوال یہ ہے کہ آخر مقدمے کے ایک فریق کو یہ ترجیحی حق کس بنا پر حاصل ہوا ہے؟ اس کا ماخذ اسلام ہے؟ یا عقلِ عام؟ یا درحقیقت یہ اس بات کی سزا ہے کہ فریقِ ثانی نے کیوں آپ کو ووٹ دے کر اقتدار کی مسند پر بٹھانے کی حماقت کی؟

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انتظامی حکومت اور اس کے کارکنوں کو وسیع سے وسیع تر اختیارات دینے کا

رجحان ہمارے قوانین میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے، اور یہ اس صورت میں اور بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے جبکہ بالعموم پبلک کے لیے عدالتوں سے فریاد کرنے کا راستہ قانوناً بند کر دیا جائے اور عدالتی فیصلے کے لیے خاص عدالت کی شرط لگا دی جائے۔ ان وسیع اور غیر معمولی اختیارات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

پنجاب کا قانونِ مصائبِ قومی، ریلیف کمشنر کو یہ اختیارات دیتا ہے کہ آفت رسیدہ علاقے میں جس کی جو چیز چاہے طلب کر لے، خواہ وہ زمین ہو، عمارت ہو، سامان ہو، سواری ہو یا کچھ اور۔ جس عمارت کو چاہے توڑ دے۔ جس کو چاہے جبری خدمت کے لیے بلالے۔ جس کو چاہے کسی کام سے روک دے یا کسی حکم کا پابند بنا دے۔ وہ اپنے احکام کی تعمیل کرانے کے لیے ہر طرح کی قوت استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ وہ اپنے یہ وسیع اختیارات اپنے ماتحتوں میں سے جس کو چاہے تفویض کر سکتا ہے۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی فوجداری جرم، قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہے۔ مگر وہ خواہ کوئی بھی زیادتی کر جائے، اس کے کسی حکم کے خلاف نہ تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکتا ہے، اور نہ کسی نقصان کی تلافی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

نقصان رسیدہ علاقوں کی اصلاح کے لیے پنجاب میں جو قانون بنایا گیا ہے وہ حکومت کو اختیار دیتا ہے کہ وہ جس علاقے کو چاہے نقصان رسیدہ قرار دے کر امپرومنٹ ٹرسٹ کے حوالے کر دے۔ "نقصان رسیدہ" کی کوئی تعریف نہیں کی گئی جس سے معلوم ہو کہ اس اصطلاح کے معنی کیا ہیں اور کس قسم کے علاقے کو اس سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ امپرومنٹ ٹرسٹ اس علاقے کی اصلاح کے لیے جو اسکیم بنائے اس کو عمل میں لانے کے لیے وہ جس زمین یا مکان کو چاہے بیع، پٹہ، تبادلہ، یا کسی اور طرح حاصل کر سکتا ہے۔ جس عمارت یا حصہ عمارت کو چاہے گرا سکتا ہے جس مکان یا جھونپڑی کو چاہے دو دن کے نوٹس پر خالی کرا سکتا ہے (بغیر اس کے کہ اس کے مکینوں کو کوئی دوسرا ٹھکانا دلوانے کی ذمہ داری اس پر یا کسی اور پر عائد ہوتی ہو)۔ اور اس سلسلہ میں جو چیز بھی حاصل کی جائے اُس کا معاوضہ مشخص کرنے کا اختیار قطعی طور پر حکومت کے اُس افسر کو دے دیا گیا ہے جو ضلع میں جائدادوں کی تحصیل کے لیے کلکٹر مقرر کیا گیا ہو۔ جو شخص اس معاملہ میں کسی طور پر امپرومنٹ ٹرسٹ کی مزاحمت کرے، اس کو دو سال تک قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ مگر خود اس شخص کے لیے کسی زیادتی کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

زیادہ سے زیادہ بس وہ معاوضے کا مسئلہ عدالت میں لے جا سکتا ہے، مگر عام عدالت میں نہیں بلکہ ٹریبونل میں۔

جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے پنجاب میں جو قانون بنایا گیا ہے وہ ہر پولیس افسر کو، یا ہر اُس شخص کو جسے حکومت اس کام پر مقرر کرے، یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ جسے چاہے اس قانون کی خلاف ورزی پر بلا وارنٹ گرفتار کر لے۔

چوتھی خصوصیت ان نوساختہ قوانین کی یہ ہے کہ ان میں شریعت کے قطعی احکام کی خلاف ورزی کا سلسلہ حسب سابق جاری ہے۔ مثال کے طور پر ابھی جو زرعی اصلاحات کا قانون پنجاب میں پاس کیا گیا ہے اُس میں واضح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں کہ حکومت جن موروثی کاشتکاروں کو زمینوں کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے قرض دے گی، ان سے سود وصول کرے گی۔ اسی طرح سود کے معاملے کی تصریح نقصان رسیدہ علاقوں کی اصلاح کے قانون میں بھی موجود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ارباب حکومت اپنی نئی قانون سازی میں بھی اسلامی احکام کی پروا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، کجا کہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ پچھلے دور کے قوانین کو بھی اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی کوشش فرمائیں گے؟

ایک اور عجیب خصوصیت ان قوانین میں یہ پائی جاتی ہے کہ ان میں بڑی بےفکری کے ساتھ صریح غیر معقول دفعات شامل کر دی گئی ہیں اور اس بات کی بالکل پروا نہیں کی گئی کہ غیر معقول احکام سے نہ صرف قانون کا احترام دلوں سے اٹھ جاتا ہے، بلکہ اُس ریاست کی عزت پر بھی حرف آتا ہے جس کے قوانین ایسے احکام پر مشتمل ہوں۔ ذیل کی چند مثالیں صرف ایک قانون سے لی گئی ہیں جو پنجاب میں زرعی اصلاحات کے لیے منظور ہوا ہے:

(۱) مالکان زمین کو جو رقبہ خود کاشت کے لیے اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کو یا اس کے کسی حصے کو وہ خود اپنی زمین کے کسی رقبے سے اُس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک کہ ان کے خود کاشت رقبے کا کم از کم ۵۰ فیصدی حصہ سیم یا تھور سے ناقابل کاشت نہ ہو گیا ہو۔ البتہ اگر اسی زمین کا ایک فی صدی حصہ بھی دریا برد ہو جائے، یا حکومت اپنے کسی کام کے لیے حکماً حاصل کر لے تو وہ اس کے بقدر دوسرا کوئی رقبہ اپنے

خود کاشت رقبے میں شامل کر سکتے ہیں۔

(۲) جو زمین اس قانون کے نفاذ سے پہلے باغبانی کے لیے استعمال ہو رہی تھی وہ قابلِ کاشت کی تعریف میں نہ آئیگی، اور مالکِ زمین اس کے علاوہ ۵۰ ایکڑ اپنی خود کاشت کے لیے مخصوص کر سکیگا۔ لیکن جو زمین اس قانون کے نفاذ کے بعد اسی مقصد کے لیے استعمال کی جائے وہ قابلِ کاشت سمجھی جائے گی اور اسے بھی خود کاشت رقبے میں شمار کیا جائے گا۔

(۳) جو زمین کاغذاتِ مال میں "بنجر قدیم" لکھ دی گئی ہے، قانون اُسے بنجر ہی سمجھتا رہیگا خواہ وہ عملاً قابلِ کاشت ہی کیوں نہ بنالی گئی ہو۔

(۴) زمینداروں کے لیے ازروئے قانون یہ طے کیا گیا ہے کہ وہ بٹائی میں ۴۰ فی صدی سے زیادہ حصہ نہیں لے سکتے، لیکن صاف لکھ دیا گیا ہے کہ خود گورنمنٹ جن زمینوں کی مالک ہے ان پر وہ اپنے کاشت کاروں سے بٹائی لینے میں اِس قانون کی پابند نہ ہوگی۔ بالفاظِ دیگر انصاف کے دو معیار ہیں، ایک حکومت کے لیے، دوسرا لوگوں کے لیے۔

(۵) جو موروثی مزارعین اب تک بٹائی پر کاشت کر رہے تھے وہ بلا معاوضہ اپنی بٹائی کے بقدر حصے کے مالک بن جائیں گے۔ مگر جو نقد لگان ادا کر رہے تھے اُن کو مالک بننے کے لیے معاوضہ دینا پڑیگا

اس کے علاوہ ان قوانین میں ایک اور سخت مذموم رجحان یہ بھی پایا جاتا ہے کہ باشندوں کے درمیان انصاف و قانون میں مساوات ملحوظ رکھنے کے بجائے ان کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا جا رہا ہے، اور مختلف طبقوں کے لیے انصاف کے الگ معیار بنائے جا رہے ہیں۔ کہیں عوام اور ان کے نمائندوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا گیا ہے، کہیں زمینداروں کو دو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے، کہیں کاشت کاروں کے کئی طبقے بنا دیے گئے ہیں، اور پھر ان مصنوعی تقسیمات کے ساتھ ہر ایک طبقے کے حقوق اور امتیازات الگ الگ معیاروں کے لحاظ سے مقرر کیے گئے ہیں۔ ان کارروائیوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیز إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا کی ایک عملی تفسیر شروع ہوئی ہے۔

اسلامی تحریک دوسری تحریکوں کے مقابل میں

نعیم صدیقی

گذشتہ سے پیوستہ

پھر سرمایہ دارانہ جمہوریت کی ساخت ایسی ہے کہ اس میں تبدیلی کی حرکت حد درجہ سست رفتار ہوتی ہے۔ تبدیلی کے لئے طریقہ ہی اتنا پُر پیچ ہے کہ "آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک"! مثلاً اپوزیشن کی طرف سے کسی قانون میں کوئی اہم ترمیم مطلوب ہے۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ اس ترمیم کو اخبارات اور جلسوں کے ذریعے پبلک کے سامنے رکھا جائے اور رائے عام کو اس کے حق میں ہموار کیا جائے۔ دوسرا قدم یہ ہے کہ اس کے لئے عام مطالبے کی ایک لہر پیدا کر کے دکھا دی جائے۔ اس کے بعد اگر آپ اسے پارلیمنٹ میں پیش کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ اسے قبول کر لیا جائے۔ اب پھر آپ عوام کے سامنے فریاد لے کے نکلے۔ پھر آپ نے احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع کیا، اور دوسری طرف پارلیمنٹری پارٹیوں سے ساز باز کی مہم کا آغاز کیا اور ایک مدت کے بعد دوبارہ اس ترمیم کو کسی اجلاس میں لائیے۔ ہوسکتا ہے کہ ملک کے دباؤ کے تحت اسے قبول کر لیا جائے، لیکن اس میں حکمران طاقت اتنا تصرف کر دیتی ہے کہ ترمیم کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ الغرض ایک چھوٹی سی تبدیلی کے لئے بسا اوقات برسوں کی جدوجہد مطلوب ہوتی ہے لیکن اگر کچھ ذرا بڑی تبدیلیاں مطلوب ہوں تو پھر آپ میدان میں نکلئے اور ایک نئی پارٹی تیار کیجئے، اس کی توسیع و استحکام میں عمر کھپائیے اور جب پھر وہ پارٹی جوان ہو کر رائے عام کو ساتھ لے لے تو پھر وہ موقع آئے گا کہ حالات میں چند تبدیلیاں واقع ہوں۔ اس سے بھی آگے اگر آپ دستور

؎ پاکستان میں اس کی اہم مثال سیفٹی قوانین ہیں جن کے خلاف ملک چار سال سے چیخ رہا ہے، پریس ان کے خلاف لکھ رہا ہے، جلسوں میں ہزاروں مرتبہ ریزولیشن پاس ہوچکے ہیں۔ "لیکن زمین جنبد نہ جنبد گل محمد"! ان "گل محمد" صاحب سے نجات پانے کے لئے بیچارے پاکستان کی پارٹیوں کو مزید کتنی مدت تک ایڑیاں رگڑنی پڑیں۔

ہی کو بدلنا چاہتے ہوں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو سول وار لڑنی پڑے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت "فرد کی آزادی" کا ڈھول خوب پیٹتی ہے۔ مگر یہ آزادی فی الحقیقت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ فرد سرمایہ دار طبقہ کے مفاد کے خلاف کوئی جنبش نہ کرے۔ ورنہ پھر یہ جمہوریت فاشزم کی سطح پر آکھڑی ہوتی ہے۔ چنانچہ امریکہ میں جو لوگ سرمایہ دارانہ نظام کو بنیادی طور پر بدلنا چاہتے ہیں ان کی سرگرمیوں کے لئے سرکاری اصطلاح جو استعمال کی جا رہی ہے وہ "امریکہ دشمن سرگرمیاں" Un-American Activities کی ہے۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں ان سرگرمیوں کی جڑیں کھودنے کی باقاعدہ مہم شروع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اور اس کے بعد "امریکہ دشمن سرگرمیوں" کا جن افسروں پر شبہ ہوا ان کو برطرف Purge کیا جا رہا ہے اسی مقصد کے لئے "سول سروس کمیشن" کی جگہ اب "فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن" کو دی گئی ہے جو ۱۹۴۷ء سے تمام سول ملازمین کا جائزہ لینے پر مامور ہے کہ "کمیونسٹ میلانات" کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔

اس توضیح سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جمہوری نظاموں میں کسی بڑی اصولی تبدیلی کے لئے کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔

آخر میں یہ بھی کہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ الحاد نے جو اخلاق باختہ انسان تعمیر کر کے دیا ہے وہ اپنے آپ پر بھی اعتماد کرنے پر تیار نہیں ہے۔ چنانچہ مغربی جمہوریتوں کا ایک بڑا مفسدہ یہ ہے کہ حکومت اور عوام، صدر اور پارلیمنٹ، نمائندے اور ووٹر سب کے سب ایک دوسرے کو بے اعتمادی سے دیکھتے ہیں۔ اس بے اعتمادی کی وجہ سے طرح طرح کی پابندیاں اور قسم قسم کی قیود ہیں جو جمہوریت کے طریق کار میں قدم قدم پہ لگائی جاتی ہیں۔ لیکن اخلاقی دیوالیہ پن اپنا جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ اس عام بے اعتمادی نے بھی جمہوری نظاموں کو کھوکھلا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

حضرات! یہ وہ مفاسد ہیں کہ جن کی وجہ سے مغرب کے جمہوری نظاموں کے اندر وہ جوہر

بالکل تباہ ہو گیا ہے کہ جس کے بغیر جمہوری نظام میں سرے سے کوئی قدر وقیمت باقی نہیں رہتی۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت کا معاشی پہلو مغرب میں تحریک جمہوریت کے ساتھ ساتھ جو نظامِ معیشت پروان چڑھا ہے اسے ہم سرمایہ دارانہ نظام کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مغرب کے دورِ جدید کی سربراہ کاری بورژوا طبقہ کے ہاتھ میں تھی اور اس نے جمہوری انقلاب اور صنعتی انقلاب کے پورے کے پورے فوائد اپنے لئے سمیٹ لینے میں پوری پوری خود غرضی سے کام لیا۔ پرانے بادشاہوں کو اور جاگیرداروں اور پوپوں کو ان کے مقام سے ہٹا کر یہ لوگ خود ان کی خالی جگہوں پر قابض ہو گئے۔ ظلم کی جو تلواریں پرانے ظالموں کے ہاتھوں سے چھینی گئی تھیں اُن کو اِن نئے ظالموں نے اپنی کمر سے باندھ لیا۔ اب جو نیا نظام بنا اس کی بنیادیں اس طبقہ نے اپنے مفاد کے مطابق استوار کیں۔ علوم و فنون، حکومتوں کے ڈھانچے، قوانین کی حد بندیاں، تعلیم کے نقشے اور سوسائٹی کے مختلف اداروں کے طریقہ ہائے کار اسی طبقہ کی اغراض کے سانچوں میں ڈھل گئے۔ اس طرح جمہوری تحریک کے سائے میں معاشی نظام نے جو نشو و نما پائی وہ بھی سرمایہ دارانہ معیشت پر منتج ہوئی۔

سرمایہ دارانہ معیشت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی گئیں ان میں سے بڑے بڑے اصول یہ ہیں:۔

اس نظام کا پہلا اصول یہ ہے کہ شخصی ملکیت کا حق بالکل غیر محدود ہونا چاہیئے۔ افراد کے لئے پوری آزادی ہو کہ وہ جو املاک جیسے چاہیں حاصل کریں، اُن کو نفع اندوزی کا ذریعہ بنائیں، اور ان کے بل پر دنیائے معیشت میں تاخت کریں۔ اس حق پر بالعموم کوئی قانونی و اخلاقی قید نہ ہونی چاہیئے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ فرد کے لئے آزادیِ سعی کا پورا پورا حق محفوظ ہونا چاہیئے یعنی اپنے سرمائے، اپنے وسائل، اپنے دماغ اور اپنی محنت کو افراد میدانِ معیشت میں جس جس طریقے سے بھی استعمال کرنا چاہیں اور جو جو بھی فائدے ان کے بل پر اٹھانا چاہیں، اس میں

ان کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ سوسائٹی کو آزادیٔ سعی کے اس حق میں رکاوٹیں ڈالنے سے باز رہنا چاہیئے۔

تیسرا اصول یہ ٹھیرا کہ معیشت کے ارتقا اور معاشی معاملات کی درستی کے لئے ذاتی نفع محرک عمل ہوگا۔ نفع کا محرک ہی سرمایے اور قویٰ کو میدان میں لائے گا، نفع کا محرک ہی زراعت، صنعت اور تجارت کی ترقی کا موجب ہوگا، نفع کا محرک ہی کثیر پیدا آوری اور زود پیدا آوری کا ذریعہ بنے گا، نفع کا محرک ہی ایجاد و اختراع کا ضامن ہوگا اور نفع کا محرک ہی سوسائٹی کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کا وسیلہ ہوگا۔ پھر نفع کا محرک ہی مقابلہ پیدا کرے گا اور یہی محرک قیمتوں کو سنبھالے گا۔

چوتھا اصول سرمایہ دارانہ معیشت نے یہ اختیار کیا کہ آزادانہ مقابلہ و مسابقت کی فضا قائم رکھی جائے گی۔ افراد اپنے اپنے سرمایے اور اپنی اپنی صلاحیتوں اور اپنے اپنے ذرائع و وسائل کو لے کر میدانِ معیشت میں جس طرح چاہیں آزادی سے مقابلہ و مسابقت کریں۔ آزادانہ مقابلہ و مسابقت کی فضا میں جو جس کو پچھاڑ لے اور جو جس طرح چاہے آگے بڑھ جائے، اس میں سوسائٹی کی مداخلت نہ ہونی چاہیئے۔

پانچواں اصول یہ طے پایا کہ اجیر اور مستاجر کے حقوق میں بالکل بنیادی فرق ہے اور اسے بحال رکھ کر ہی ان کے باہمی مسائل کو طے ہونا چاہیئے۔ ہر کاروبار میں مالک اور ملازم و مزدور، دو الگ الگ عناصر بالکل الگ الگ حیثیتیں رکھتے ہیں۔ مستاجر جس کا سرمایہ لگتا ہے، جو ساری منصوبہ بندی کرتا ہے، جو کاروبار کے نفع کے ساتھ ساتھ نقصان کا خطرہ بھی مول لیتا ہے اس کے حقوق بالکل جداگانہ ہیں، اور اجیر جس کو ہر حال میں اپنی اجرت سے مطلب ہے اس کے حقوق بالکل دوسرے ہیں۔ ان دونوں کے باہمی معاملات حالات کے زیرِ اثر خود بخود جس طرح طے ہوتے رہیں وہی فطری صورت ہے۔ مستاجر کی کوشش فطرۃً یہ رہے گی کہ وہ اجیر کو کم سے کم دے اور اجیر کی جدوجہد لازماً یہ ہوگی کہ وہ اپنی محنت کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ پائے۔ دونوں کی یہ کشمکش بالکل فطری ہے اور یہ فطری کشمکش فطری قوانین کے تحت خود بخود کسر و انکسار سے گذر کر اجیر اور مستاجر

کے درمیان حقوق کا توازن قائم رکھے گی۔

چھٹا اصول یہ ہے کہ معاشی ارتقا کا دار و مدار فطری قوانین پر ہونا چاہیئے۔ یعنی جس نظامِ معیشت میں ذاتی نفع ہی محرکِ عمل ہو، اس میں کاروباری طبقہ مجبور ہے کہ میدانِ مسابقت میں اچھے سے اچھے آلات استعمال کرے، بہتر سے بہتر تنظیم پیدا کرے، اجناسِ خام ارزاں سے ارزاں حاصل کرے اور ترقی کی ہر ممکن تدابیر اختیار کرے۔ اس وجہ سے سرمایہ دارانہ معیشت کی منصوبہ بندی قوانینِ فطرت خود بخود بہترین طریق پر کرتے رہتے ہیں۔ اس نظام میں کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہاں قوانینِ فطرت پر کلّی اعتماد کرنا چاہیے۔

ساتواں اصول یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت کی فلاح و ترقی اور اس کے فطری نتائج کے ظہور کا دار و مدار ریاست کی عدم مداخلت پر ہے۔ ریاست افراد کے مفاد کی محافظ ہے، ان کے حقوق کی نگراں ہے، انکی ترقی کے لئے امن اور نظم قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے، مگر ان کی کاروباری سرگرمیوں میں مداخلت کرنا اس کا کام نہیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے مفاسد یہ اصول جو سرمایہ دارانہ معیشت نے اختیار کئے تھے ان میں بعض بڑی بڑی صداقتیں بھی شامل تھیں، لیکن ان صداقتوں کو بعض مہلک تصورات کے ساتھ ترکیب دی گئی اور پھر یہ مرکب اصول جب تہذیبِ الحاد کے غیر اخلاقی ماحول میں اُس خطرناک انسان کے استعمال میں آئے جو تہذیبِ الحاد کے سانچے میں ڈھلا تھا تو ان اصولوں نے مفاسد کے برگ و بار لانے شروع کر دیے۔

سب سے بڑی بنائے فساد تو یہ تھی کہ بے قید نظامِ معیشت میں سوسائٹی کے سارے عناصر اور سارے طبقات کے لئے فوائد سمیٹنے کے مواقع یکساں نہ تھے، بلکہ اس نظام میں لُٹس مچانے کا موقع پورے کا پورا سرمایہ دار طبقے کے لئے تھا، اور اس نے اس خوانِ یغما کو لوٹنے میں واقعۃً بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ انفرادی آزادی اور آزاد مقابلہ کی فضا صرف اُسی ایک طبقے کو راس آسکتی تھی جو سرمایہ، دماغ، سیاسی اختیارات اور اثر و رسوخ وغیرہ سارے ہی پہلوؤں

سے بالا دست تھا۔

اندریں حالات حکومت کی عدم مداخلت کے اصول نے اور ستم ڈھایا۔ مشین کی کثیر پیدا آوری جب بے کاری کا بگل بجاتی ہوئی آئی تو محنت پیشہ لوگ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں آ آ کر سرمایہ دار طبقے کے قدموں میں گرنے لگے۔ محنت کاروں کی اس بے بسی سے سرمایہ دار طبقہ نے اپنی بالادستیوں کا پورا پورا ناجائز فائدہ اٹھایا اور من مانی اجرتوں اور شرائط پر انسانی محنت کو غلامی میں لے لیا۔ انسان بالکل جانوروں کی طرح استعمال کئے گئے اور جہاں کوئی ناکارگی کی حالت میں مبتلا ہوا اس کو کورا جواب دے کر بے بسی کے کھڈ میں دھکیل دیا گیا۔ حکومتیں جو سرمایہ دار طبقہ کے زیر اثر تھیں اس صورتِ حالات کو دیکھتی رہیں لیکن وہ کچھ نہ کر سکیں، کیونکہ وہ عدم مداخلت کے اصول کی پابند تھیں۔

دوسرا بڑا مفسدہ یہ پیدا ہوا کہ "نفع" جب نصب العین ٹھیرا تو ذاتی مفاد کے لئے سرمایہ دار طبقہ نے اجتماعی مفاد کو شدید سے شدید ضرر پہنچانے میں بھی کوئی تأمل نہ کیا۔ چنانچہ نفع پرستی نے ذخیرہ اندوزی کر کے قیمتیں چڑھانے اور ایک ایک جنس کے کئی کئی بار غائبانہ سودے کر کر کے اس میں سے بار بار نفع نچوڑنے کی بیماری پیدا کر دی۔ پھر قیمتوں کو مطلوبہ سطح سے نیچے گرنے سے روکنے کے لئے ہزارہا ضرورت مندوں کو آنکھوں کے سامنے ترستا چھوڑ کر اجناس اور پیداوار کو سمندر میں ڈبونے اور آگ لگا کر تلف کر دینے تک کے طریقے اختیار کئے جانے لگے۔ پھر اسی نفع پرستی نے سرمایہ دار طبقہ کو اتنا پست کر دیا کہ انھوں نے اپنی قوموں میں تعیشات کا روگ پھیلایا تاکہ ان کے لئے کمائی کا وسیع میدان پیدا ہو۔ انہوں نے نہائت درجہ مضرِ صحت اور مخربِ اخلاق مصنوعات کو بیچ کر نفع حاصل کرنے کے لئے اپنی ہی قوموں میں دلکش پروپیگنڈے کے ذریعے انکی چاٹ پیدا کی۔ تکلفات اور آرائشات کو بڑھا کر اور ضروریات اور تفریحات کا میدان وسیع کر کر کے عوام کی جیبیں کاٹی گئیں۔ پھر یہ نفع پرستی ہی تھی کہ جو اپنی قوم کی قوتِ خرید کو پوری طرح نچوڑ لینے کے بعد دوسری قوموں میں منڈیاں بنانے کے لئے نکلی اور اس مقصد کے لئے اس نے نوآبادیاتی

کشمکش اور جنگ و جدال کا ایک طوفان اٹھا کر پورے کرۂ ارض کو امن و امان سے محروم کر دیا۔

تیسرا بڑا مفسدہ جو اس نظام کے بطن سے رونما ہوا، سودخواری کا مفسدہ تھا۔ نفع پرستی کے روگ نے اہل سرمایہ میں سیرت کی اتنی پستی پیدا کر دی کہ وہ اپنا زائد سرمایہ کسی فرد اور فرم تو کیا، اگر حکومت اور قوم کو بھی مستعار دیں تو اس شرط پر دیں کہ لینے والے کو نفع ہو یا نقصان، ان کو بہرحال طے شدہ منافع ملنا چاہیئے۔ حد یہ کہ اگر ملک و قوم کسی دشمن کی مدافعت کے لئے بھی قرض لیں تو دفاع کے لئے جانیں دینے والوں کے مقابلے میں اس ذلیل طبقے کا مطالبہ بہرحال اپنی جگہ اٹل تھا کہ ان کے سرمائے پر اتنے فیصدی سود سالہا سال تک ضرور ادا ہوتے رہنا چاہیئے۔ سود کے اصول پر منافع کے یک طرفہ بہاؤ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ معاشی توازن تیزی سے بگڑتا گیا۔

چوتھا مفسدہ یہ رونما ہوا کہ اس نظامِ معیشت نے اخلاقی دیوالیہ پن کو عملاً مکمل کر دیا۔ ہمدردی، تعاون، رحم، شفقت اور اس طرح کے دوسرے تمام انسانی اوصاف سوسائٹی میں بالکل مرجھا کر رہ گئے۔ معاشرہ کے رگ رگ میں زرپرستی، بندگیٔ شکم، خودغرضی اور دوسرے حیوانی جذبات کا زہر پوری طرح سرایت کر گیا۔

اور ان سارے مفاسد کا مجموعی نتیجہ ایک اور بڑے مفسدے کی صورت میں رونما ہوا۔ وہ یہ کہ سوسائٹی میں فرد فرد اور طبقے طبقے کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ قومیں داخلی طور پر ظالم اور مظلوم عناصر میں بٹ گئیں اور ان عناصر کی باہمی کھینچا تانیوں نے سارے نظامِ تمدن کو امن و سکون سے محروم کر دیا۔

یہ ہیں وہ مفاسد جو اس نظام کی مجموعی ترقی میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ آج حال یہ ہے کہ مشینیں زیادہ پیداواریں دے سکتی ہیں مگر چونکہ عوام کی قوتِ خرید گر رہی ہے اس لئے مشینوں سے مزید کام لینا بے کار ہے۔ سرمایہ وافر مقدار میں موجود ہے مگر سرمایہ لگانے کے راستے بند ہیں۔ کام کرنے والے موجود ہیں مگر کام نہیں، اس لئے وہ بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس طرح مجموعی ترقی رک گئی ہے۔

ان مفاسد کو خود سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے کارپرداز بھی محسوس کر رہے ہیں۔ ان کے خلاف ذہین لوگ چیختے اور چلاتے بھی ہیں، اور یہ ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ حالت ہونی نہ چاہیئے۔ لیکن اصلاح کی جو تدابیر اس نظام کے کارپرداز اختیار کر رہے ہیں وہ کسی اصولی تبدیلی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اس نظام کے سارے اصولی مفاسد کو جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے کوشش یہ کی جارہی ہے کہ مزدوروں کو مزید کچھ مراعات دے دی جائیں۔ کہیں ان کی اجرتوں میں کچھ اضافہ کیا جارہا ہے کہیں کچھ پنشنیں دینے کا انتظام ہو رہا ہے، کہیں ان کو علاج کی مزید سہولتیں دے دی گئی ہیں اور کہیں ان کے لئے کاروبار کی حصہ داری کے دروازے کھولے جارہے ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے، انصاف کرنے کے جذبے سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ محض کمیونزم کی روک تھام کے لئے ہو رہا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ کے لئے ایک آخری دفاعی پالیسی ہے جو امریکہ، برطانیہ اور دوسرے جمہوری ممالک میں اختیار کی جارہی ہے۔

اس گفتگو سے آپ اندازہ کر سکتے کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی تحریک نے انسانیت کو جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہ کیا مقام ہے۔ انسان جس جنت کا تصور باندھ کر اس کی انگلی پکڑ کے چلا تھا آج وہ تصور درہم برہم ہو چکا ہے۔

۲۔ سوشلزم

تہذیبِ الحاد کے بطن سے سرمایہ دارانہ جمہوریت کی جو تحریک نمودار ہوئی تھی وہ جب اس تلخ انجام تک انسانیت کو پہنچا چکی اور اس کے خلاف ہر طرف ایک صدائے احتجاج بلند ہونے لگی تو اس مادرِ تہذیب نے دنیا کو ایک اور تحریک جَن کے دی جسے اشتراکیت اور سوشلزم کا نام دیا جاتا ہے۔

سوشلزم کی تحریک جمہوریت کی تحریک سے جتنے اختلافات اور تضاد رکھتی ہے ان کے باوجود اس کی فطرت، اس کی سیرت، اس کا مزاج، اس کی ذہنی بنیادیں اور اس کی رگوں کا خون وہی ہے جو اس کی پرانی حریف تحریک کا تھا۔

یہ تحریک سرمایہ دارانہ جمہوریت کے مفاسد کے ردِ عمل کے طور پر نمودار ہوئی ہے ۔ یہ ایک ایسی ذہنی فضا میں پروان چڑھی ہے جس میں انتقامی جذبات رچے بسے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے یہ اپنے مزاج میں ایک جذباتی انتہا پسندی اور ایک اندھا تشدد لئے ہوئے ہے ۔ یہ تہذیبِ الحاد کے خلاف پوری انسانیت کی طرف سے اعلانِ جنگ کرنے نہیں اٹھی، بلکہ تہذیبِ الحاد کے سائے میں ایک طبقے کی طرف سے دوسرے طبقے پر حملہ بولنے اٹھی ہے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت کے مقابلے میں جو نیا فکری جوہر اس نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کو جنت بنانے کے لئے اور سوسائٹی کو امن اور خوشحالی اور ترقی دینے کے لئے بنیادی اصلاح یہ ہے کہ انسانی آزادی کا قطعی طور پر خاتمہ کر دینا چاہیئے اور افراد کو ایک قاہرانہ نظامِ اجتماعی کے تحت جکڑ کر اصلاح کو باہر سے بالجبر اس کے اوپر مسلّط کرنا چاہیئے اور اصلاح کی اس تدبیر کو عمل میں لانے کے لئے پہلے ہی قدم پر فرد کے حقوقِ ملکیّت کا کلی استیصال کر دینا ناگزیر ہے ۔

جمہوری اشتراکیت فکری لحاظ سے اس تحریک کی کئی شاخیں ہیں جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں ۔ لیکن عملی حیثیت سے اس کی دو ہی بڑی قسمیں ہیں :۔

ایک ہے جمہوری اشتراکیت Democratic Socialism اور دوسری ہے انقلابی اشتراکیت Revolutionary Socialism

جمہوری اشتراکیت کے علمبردار "قومی ملکیّت" کے اصولوں کو تدریجی طور پر آئینی ذرائع سے نافذ العمل کرنے کو زیادہ صحیح سمجھتے ہیں ۔ لیکن اب تک اس طریقے کو جہاں جہاں آزمایا گیا ہے، تجربات حوصلہ افزا نہیں ہیں ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جمہوری اشتراکیت اب تک بالکل ناکام ہے اس کا سب سے بڑا اور مکمل تجربہ برطانیہ میں لیبر پارٹی نے کیا ہے[1] ۔ لیکن واقعات گواہ ہیں کہ یہ

[1] جمہوری اشتراکیت کے تجربے کے لئے برطانیہ سے بہتر فضا کسی اور ملک میں نہ کبھی تھی، نہ ہے ۔ برطانیہ اس لحاظ سے دوسرے تمام ممالک سے پیش پیش ہے کہ وہاں کوئی گروہ رائے عام کو تیار کر کے آئینی طریق سے حالات کو تدریجاً بدل سکے۔

تجربہ بُری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ جتنی بھی صنعتوں کو لیبر پارٹی نے نیشنلائز کیا بلا استثنیٰ ان میں سے ہر ایک کی یا تو پیداآوری میں کمی آئی ہے یا پیداواروں کی قیمتیں نمایاں طور پر چڑھی ہیں اور بین الاقوامی مسابقت کے میدان میں برطانیہ نے نیشنلائزیشن کی پالیسی اختیار کرنے کے بعد اپنی پسماندگی کو بُری طرح محسوس کیا ہے۔ چنانچہ لیبر پارٹی کو ہٹا کر کنزرویٹو پارٹی کو برطانوی عوام کا دوبارہ برسرِ اقتدار لانا صرف مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کا ردِّ عمل ہی نہیں ہے بلکہ نیشنلائزیشن کی ناکامی کا دخل بھی اس میں اوّلین اہمیت رکھتا ہے۔

یہ تجربہ ناکام کیوں ہوا؟ اس کے تین سبب ہیں:-

ایک یہ کہ پوری صنعتوں کو بلکہ پورے ذرائع پیداوار کو نیشنلائز کرنے کے بجائے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے فریم کے اندر ہی اندر چند صنعتوں کو حکومت کی تحویل میں لیا گیا۔ اس طرح ایک نظامِ معیشت میں دوسرے نظامِ معیشت کا پیوند لگانے سے وہ تضاد پیدا ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے نیشنلائزیشن کے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک صنعت کا دامن دوسری تمام صنعتوں سے، بلکہ زراعت اور تجارت کے نظام سے بھی بندھا ہوتا ہے۔ اس لئے پورے نظامِ معیشت میں سے چند صنعتوں کو الگ کر کے نیشنلائز کرنے سے وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو ہونا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ قومی ملکیت کے اصول کو صنعتوں پر نافذ کرتے ہوئے یہ بہت ہی ناگزیر ہے کہ ملک کو بیرونی دنیا سے منقطع کر لیا جائے۔ تاکہ پیداواروں، اجرتوں اور قیمتوں کو لوگ دوسرے ممالک کی پیداواروں، اجرتوں اور قیمتوں کے مقابلے میں رکھ کر نہ دیکھ سکیں۔ آہنی پردہ Iron Curtain اشتراکیت کو نافذ العمل کرنے کے لئے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ لیکن برطانیہ جیسی آزادی پسند اور جمہوریت پسند قوم اس قسم کا سلوک برداشت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تجربہ ناکام رہا۔

تیسرے یہ کہ مذکورہ بالا دونوں مقاصد کے لئے یہ بات بھی ضروری تھی کہ برطانیہ پر ایک کڑی ڈکٹیٹر شپ مسلط ہوتی، جس کے مقابلہ میں نہ سرمایہ دار طبقہ کوئی جنبش کر سکتا، نہ رائے عام

سر اٹھا سکتی، نہ پریس کان ہلاتا، نہ کوئی احتجاج کرنا ممکن ہوتا اور نہ کوئی مخالفانہ انتخابی مہم چلائی جا سکتی۔

یہ تینوں شرائط صرف انقلابی اشتراکیت ہی کے تحت پوری ہو سکتی ہیں اور جب تک یہ پوری نہ ہوں جمہوری اشتراکیت کے تجربہ کی کامیابی کا آئندہ بھی کوئی امکان نہیں ہے۔

انقلابی اشتراکیت | سوشلزم کی تحریک اگر عملاً ایک نظام دنیا کو دے سکی ہے تو صرف انقلابی راستے سے دے سکی ہے۔ انقلابی سوشلزم کا تجربہ روس کی سرزمین میں مکمل صورت میں ہمارے سامنے ہے اور ہم اس کا پورا پورا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ تفصیلات کو در کنار رکھتے ہوئے اس کے تیس سالہ دور کا جو حاصل ہمارے سامنے آتا ہے وہ اتنا ہے کہ:

(۱) املاک کا منافع افراد کی جیبوں میں جانے کے بجائے حکومت کے خزانے میں آنے لگا۔

(۲) نظامِ معیشت کے حکومت کی تحویل میں آجانے کی وجہ سے اس کی منصوبہ بندی ممکن ہوگئی۔

(۳) آدمیوں کو کام پر لگانے کا انتظام ہو گیا۔

(۴) مجموعی منافع کا ایک حصہ سوشل انشورنس کی مدمیں صرف ہونے لگا۔

لیکن اب دوسرے پہلو سے یہ دیکھیے کہ عوام کو قطعی طور پر Net ملا کیا؟ ملک کے پورے نظامِ معیشت کے مجموعی منافع کا ایک بڑا حصہ ـــــ اور بہت بڑا حصہ ـــــ تو وہ تھا جو جنگی تیاریوں میں صرف ہونے لگا، پھر بقیہ کا بٹوارہ اس طرح ہوا کہ حکمراں طبقے نے اس میں سے اپنا حصہ خوب دل کھول کر لگایا۔ چنانچہ آج اسٹالین کی بیٹی کی شادی جس شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ ہوئی ہے وہ اسی اجتماعی منافع کے بل پر ہوئی ہے جسے پیدا کرنے کے لئے شہری مزدور اور دیہاتی کسان معمولی معاوضے پاکر اپنی جان لڑاتے ہیں۔ اس اجتماعی منافع کا بشکل ایک دو فیصدی حصہ ہے کہ جو سوشل انشورنس کی مدمیں صرف ہوتا ہے۔ اس طرح عوام کے لئے حاصل خالص

جو رہ جاتا ہے وہ یہ ہے :۔

ایک یہ کہ ہر شہری کے لئے اتنے روزگار کا انتظام کہ اس کے کنبے کو روٹی کپڑا ملنے لگے۔

دوسرے یہ کہ اس کو بُرے وقت میں مالی سہارا مل جائے۔

تیسرے یہ کہ رفاہ عامہ کے مختلف ادارات برسرِ عمل رہیں۔

اب ذرا یہ بھی سن لیجئے کہ اس حاصل کی عوام کو قیمت کتنی ادا کرنی پڑی ہے۔ اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لئے اور قومی ملکیت اور کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ کو مسلط کرنے کے لئے جو طوفان بپا کرنا پڑا جان و مال کی بہت بڑی مقدار اسکی بھینٹ چڑھائی گئی۔ بہت ہی محتاط اندازہ یہ ہے کہ انیس لاکھ جانیں اس انقلاب کی نذر ہوئی ہیں۔ بیس لاکھ افراد کو سنگین سزائیں دی گئی ہیں۔ کم سے کم چالیس پچاس لاکھ افراد کو ملک بدر ہونا پڑا ہے۔ اجتماعی زراعت کی اسکیم کو نافذ کرنے کے لئے چھوٹے اور متوسط زمینداروں پر جو مظالم ڈھائے گئے ہیں وہ اتنے شدید تھے کہ بعض اشتراکی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

پھر چونکہ اشتراکی انقلاب سوسائٹی کی اُن تمام قدروں کو اُکھیڑنے والا تھا جن کی جڑیں مذہب اور اخلاق ہیں دور تک اتری ہوئی تھیں، نیز یہ انقلاب ظلم و تشدد کے بدترین طریقے اختیار کرنے کا متقاضی تھا، اس لئے اسے مذہب و اخلاق کے خلاف جنگ چھیڑنی پڑی اور سوسائٹی کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ مذہب و اخلاق کو "نانِ موعود" کی بھینٹ چڑھا دے۔ مذہب و اخلاق کی جڑیں جب اکھیڑ دی گئیں تو انسانی سیرت و کردار کی چولیں ہل گئیں اور اس کا شیرازہ بالکل بکھر گیا، اور کوئی چیز ایسی باقی نہ رہی جو انسانی فکر و عمل اور جذبات و خواہشات پر ریک کا کام دیتی۔ اس طرح رشوت، خیانت، حق ماری اور دراز دستی کا طوفان ابل پڑا۔ اور پھر اس طوفان کو روکنے کے لئے کوئی صورت اس کے سوا نہ رہی کہ تشدد اور خوف کی ایک ملک گیر فضا قائم کی جائے۔ اس فضا کو قائم کرنے کے لئے انتہائی بربریت کے ہتھیار استعمال کئے گئے جاسوسی کے نظام کا جال پھیلا دیا گیا، ملک کو این، کے، وی، ڈی کے حوالے کیا گیا جس کی

ترکیب سوسائٹی کے انتہائی کمینہ خصلت انسانوں سے کی گئی، ـــــ اور اس طرح قومی ملکیت کے باڑے میں عوام کو بھیڑ بکریاں، گائے بیلوں اور گھوڑے گدھوں کا مقام دیا گیا۔

لیکن اتنا ہی نہیں کہ یہ قیمت یک مشت ادا کرنے کے بعد عوام کا حساب چکتا ہو گیا ہو۔ بلکہ ابھی "دو وقتہ روٹی اور برے وقت کے مالی سہارے" کی قیمت بالاقساط وصول کرنے کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یعنی کمیونسٹ پارٹی جو عوام کے صرف پانچ فیصد حصے پر مشتمل ہے، ایک قاہرانہ ڈکٹیٹر شپ میں ملک کو جکڑے ہوئے ہے۔ اس پارٹی کے اقتدار کے زیر سایہ حکومت کے انتخابات محض ایک ڈرامے کی حیثیت رکھتے ہیں[1]۔ امیدواروں کی نامزدگی خود اس پارٹی کی مرضی سے ہوتی ہے۔ ایک نشست کے لئے ایک ہی امیدوار کھڑا ہوتا ہے۔ پھر عوام زیر حراست آ کر اس کو ۹۷ فیصدی اور ۹۹ فیصدی ووٹ دیتے ہیں اور وہ بلا مقابلہ کامیاب ہو کر نمائندگی عوام کا آخری مقام حاصل کرتا ہے۔

اس سوشلسٹ نظام کے تحت منصوبہ بندی کی کامیابی بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ چند افراد کا ایسا کلی اقتدار مسلط رہے کہ جس کی مرضی کے آگے لوگ بالکل جذبۂ عبودیت کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرتے رہیں اور کوئی دم مارنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اختلاف اس کے سامنے دم بخود رہے، تنقید اس کے روبرو مہر بہ لب ہو اور آزادی اس کے حضور سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی رہے۔ منصوبہ بند نظام تقاضا کرتا ہے کہ چند افراد اتنی قدرت رکھتے ہوں کہ وہ عوام کو ایک ریوڑ کی طرح اپنی مرضی کے مطابق جدھر چاہیں ہانک سکیں۔ چنانچہ صرف سیاست کے میدان ہی میں نہیں، اور صرف صنعت و زراعت کے دائرے ہی میں نہیں، بلکہ تعلیم اور ادب اور صحافت اور موسیقی اور تھیئٹر اور تفریحات اور انجمن سازی وغیرہ، سارے ہی شعبوں میں چند افراد کی ایک ٹولی کی کمانڈ چلتی ہے اور اس تحت گیرانہ کمانڈ کے سامنے کسی کے لئے مجال سرتابی نہیں ہے۔

---

[1] جیسا ڈرامہ ہمارے صوبہ سرحد میں ابھی ابھی ہوا ہے۔

دنیا کی یہ بدترین غلامی ہے کہ جس میں اولادِ آدم کی ایک بڑی تعداد کو اپنے خیالات، اپنے جذبات، اپنے احساسات، اپنے ذوق، اپنے آرٹ، اپنے قلم، اپنی زبان اور اپنی ہر چیز کو دوسروں کے سامنے گروی رکھنا پڑتا ہے۔ اس غلامی کے خلاف جس کسی نے کوئی جنبش کی ہے اس کے لئے پھر اشتراکی جنت میں زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ اسے غدار ٹھیرایا گیا ہے، اسے سبوتاژ کا مجرم گردانا گیا ہے، اسے پارٹی سے برطرف کیا گیا ہے، اسے سوسائٹی میں ذلیل کر دیا گیا ہے، اسے روٹی سے محروم چھوڑ دیا گیا ہے، اسے لیبر کیمپ میں ایڑیاں رگڑنے کے لئے مجبور کیا گیا ہے، اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ انقلابی سوشلزم کی تاریخ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ عوام بے چارے تو کیا، خود وہ بڑے بڑے اشتراکی لیڈر جن کے ہاتھوں یہ انقلاب برپا ہوا تھا، جو مارکسی تحریک کے اوّل درجے کے جان لڑانے والے سپاہی تھے، جو عوام کو تربیت دینے والے ذہین و فطین ادیب تھے، جو ایک مدّت دراز تک اشتراکی حکومت کے قابلِ اعتماد عہدہ دار اور خود کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی بنانے والے سربراہ کار رہے، وہ یک بیک غدار اور دشمنِ انقلاب اور بیرونی حکومتوں کے ایجنٹ قرار دے دیے گئے اور ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتارے گئے اور ان میں سے بعض کے متعلق تو کسی کو یہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ ان کو زمین نگل گئی یا آسمان نے اچک لیا۔

چند افراد کا یہ قہرمان اقتدار ہر لحظہ جوابی ردِ عمل کے خطرے سے دوچار ہے، اس لئے یہ اپنے چاروں طرف غداری کی بُو سونگھتا رہتا ہے اور اپنے بچاؤ کے لئے کڑی تدابیر اختیار کرتا ہے، اسی مقصد کے لئے پارٹی کو جلاب دیتے رہنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اسی مقصد کے لئے جاسوسی کا مستقل جال پھیلایا گیا ہے، اسی کے لئے ملک کی ایک بڑی آبادی کو لیبر کیمپوں میں بند رکھا جاتا ہے، اسی کے لئے ملک کو آہنی پردے میں گھیر کر بیرونی دنیا سے منقطع کیا گیا ہے۔

بزرگو! اور بھائیو! یہ ہے وہ قیمت جو انقلابی سوشلزم کے سائے میں عوام کو "دو وقت

کی روٹی اور بُرے وقت میں مالی سہارا پانے کے لئے ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اب یہ سوچنا آپ کا اپنا کام ہے کہ اتنے حاصل کے لئے اتنی قیمت دے کر کیا انسان یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس نے وہ جنتِ امن و سکون پالی جس کے لئے وہ سوشلسٹ تحریک کی رہنمائی میں تیس سال سے ایک جاں کاہ سفر کرتا چلا آرہا ہے۔

پھر سوشلزم کی تحریک کی حیثیت کو مشخص کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ بین الاقوامی فضاؤں میں بھی اسکی پالیسی کا مطالعہ کریں۔ بین الاقوامی حیثیت سے اس تحریک کے جو مظاہر ہمارے سامنے ہیں وہ اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ بوڑھے سرمایہ دارانہ امپیریلزم کے مقابلے میں ایک نوجوان سوشلسٹ امپیریلزم نئے ہتھکنڈوں کے ساتھ ارتقا کر رہا ہے۔ سفید امپیریلزم کے مقابلے میں اس سرخ امپیریلزم کی تکنیک جو امتیازی پہلو رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب سے پہلے پروپگنڈا کے ذریعے دوسرے ملکوں میں اپنے ایجنٹ اور اپنے آلات فراہم کرتا ہے، پھر جب وہ منظم ہو کر کسی ملک کے اندر سے زور کرتے ہیں تو طبقاتی جنگ کا طوفان، جتنا جتنا داخلی نظم کو کمزور کرتا جاتا ہے باہر سے یہ امپیریلزم اتنا ہی زیادہ اثر انداز ہونا شروع کر دیتا ہے، یہاں تک کہ آخر کار جہاں کہیں کمیونسٹ انقلاب تکمیل پا جاتا ہے وہاں اس امپیریلزم کا براہِ راست تسلط بھی مکمل ہو جاتا ہے۔ اس تسلط کے بعد پھر کسی بدنصیب ملک میں حالات کا جو ارتقا ہوتا ہے وہ اس سے کئی گنا زیادہ بدتر ہوتا ہے جو کہ سفید امپیریلزم کے تحت ہوتا رہا ہے۔ سوشلزم کا شکار ہونے والے ملکوں میں سرخ امپیریلزم اپنے آدمیوں کو لاکے اقتدار پر بٹھاتا ہے، باہر سے پالیسی القا ہوتی ہے، مذہب کی جڑیں جبراً کھود دی جاتی ہیں، اختلاف کرنے والے عناصر قتل اور جلا وطن کر دیے جاتے ہیں، خام اجناس اور مصنوعات کی لوٹ مچا دی جاتی ہے، تعلیم کو امپریلسٹ مقاصد کے سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے، زبان، ادب، صحافت، لٹریچر اور رسم الخط تک کو من مانی شکل دی جاتی ہے، ڈرامے، موسیقی، مصوری اور شاعری کو بالکل اپنا آلۂ کار بنا لیا جاتا ہے، تاریخ کی تدوینِ جدید سفید جھوٹ کی بنیادوں پر کی جاتی ہے ــــــ

اس طرح کی کارروائیوں کی سب سے زیادہ عبرت ناک مثالیں روسی ترکستان کے انقلاب میں مل سکتی ہیں اور اب چین اور چینی ترکستان میں بھی پیدا ہو چکی ہیں۔

امپیریلیزم کی اس روح کا بڑا نمایاں مظاہرہ یو این او اور دوسری بین الاقوامی مجالس میں اشتراکی نمائندوں کے طرزِ عمل سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ سفید امپیریلزم کے علمبرداروں کے بالمقابل بالکل وہی پوزیشن رکھتے ہیں جو دو کاروباری حریفوں یا دو شکاریوں کی آپس میں ہو سکتی ہے۔ جیسے ہتھکنڈے ایک طرف سے دیکھنے میں آتے ہیں بالکل ویسے ہی ہتھکنڈے دوسری طرف سے سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف اگر جھوٹ، چالبازی، فریب کاری اور عیاری کے ہتھیار چمکتے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف بھی بددیانتی، خود غرضی، جعل سازی اور فتنہ انگیزی ہی کے آلات کی نمائش ہے۔ حق پرستی اور خدمتِ انسانیت اور انصاف پسندی نہ اُدھر ہے، نہ اِدھر۔ دونوں کا مقابلہ ہے تو اس میں ہے کہ کمزور ممالک میں سے کون کتنوں کو اپنے زیرِ اثر کر سکتا ہے اور کون کس جنگی ناکے پر قابض ہو سکتا ہے اور کون کس ملک کی پیداواروں سے فائدہ اٹھا لے جاتا ہے اور کون کس قوم کو مالی امداد اور معاہدوں کے جال میں آگے بڑھ کر پھانس لیتا ہے، اور کون کس ملک کے نمائندوں کے ووٹ اپنے ساتھ لے لیتا ہے ـــ یہ ساری کشمکش ایک ہی مادی تہذیب کی جنی ہوئی دو تحریکوں کی کشمکش ہے اور اس میں ایک ہی سے ہتھیار استعمال ہوتے ہیں جو دونوں کو ایک ہی اسلحہ خانے سے ملے ہیں۔

غرض جو توقعات جمہوری نظام سے مایوس ہو کر انسانیت نے سوشلزم کی تحریک سے باندھی تھیں وہ اب تیس سالہ قربانیوں اور محنتوں کے بعد چُور چُور ہوئی پڑی ہیں۔

۳۔ فاشزم

دنیائے انسانیت کو جب وہ امن و اطمینان کہ جس کے خواب وہ تہذیبِ الحاد کے سائے میں دیکھ رہی تھی، نہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی تحریک سے ملا، نہ سوشلزم کی تحریک سے، تو ایک تیسری تحریک اسی تہذیب کی بنیاد پر آہستہ آہستہ پروان چڑھی جسے آج ہم فاشزم کے نام سے پہچانتے

ہیں۔ فاشزم سرمایہ دارانہ جمہوریت اور سوشلزم کے مجموعی ردّ عمل کا نتیجہ ہے۔ دونوں کے مفاسد سے بچنے کے لئے یہ ایک تیسری راہ نکالی گئی، لیکن آگے چل کر اس نے ان سے زیادہ کڑوے کسیلے پھل دیئے۔

واضح رہے کہ فاشزم ان مخصوص نظاموں کے کسی ڈھانچے کا نام نہیں جو ہٹلر نے جرمنی میں، یا مسولینی نے اٹلی میں قائم کئے گئے تھے۔ بلکہ فاشزم کے کچھ جوہری اصول ہیں کہ وہ جس ملک اور جس ڈھانچے میں بھی برسرِ عمل ہوں اپنی ایک خاص نوعیت رکھتے ہیں۔ یہ اصول کسی نہ کسی حد تک اکثر جمہوری ممالک میں بھی عمل انداز ہوئے ہیں، لیکن جرمنی اور اٹلی کے علاوہ خاص طور پر ان کو جنوبی امریکہ، ترکی، یوگوسلاویہ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، پولینڈ، لٹویا، اسٹونیا، ہسپانیہ، آسٹریا، جاپان وغیرہ نے کسی نہ کسی درجے میں اپنے نظامِ اجتماعی کا ترکیبی عنصر بنایا ہے۔ جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور مسولینی نے ان اصولوں کو منضبط کیا اور ان پر باقاعدہ مکمل نظام چلا کر دکھائے اور ان کو ایک مستقل تحریک کی حیثیت میں ڈھالا۔ اس وجہ سے فاشزم کا نام آتے ہی جرمنی اور اٹلی کے نام ذہنوں میں ابھر آتے ہیں۔

فاشزم دراصل "سرمایہ داری زیرِ تسلطِ ریاست" State Controlled Capitalism کا دوسرا نام ہے۔ اسکی بہت متوازن تعریف یوں کی گئی ہے:۔

"فاشزم اسی پالیسی کا نام ہے جو شخصی ملکیت کو باقی رکھتی ہے، مگر ایک مضبوط اسٹیٹ کنٹرول کے تحت اس کو جکڑ دیتی ہے، لبرل ڈیموکریٹک پارٹی گورنمنٹ کے طریقہ کو ردّ کر کے ملک میں ایک کُلی اسٹیٹ Totalitarian State قائم کرتی ہے جسے ایک گروہی حکومت Hierarchy چلاتی ہے، (یعنی چند طاقت ور اشخاص کا ایک متحد و منظم گروپ)۔ ملک میں اس ایک جماعت

لے

کے سوا کسی سیاسی پارٹی کو از روئے قانون باقی نہیں رہنے دیا جاتا، اور طاقت ور منظم اقلیت اسلحہ، پروپگنڈا اور جاسوسی کے بل پر اکثریت کو غلام بنا رکھتی ہے"۔

تحریک فاشزم اپنی داخلی روح کے اعتبار سے سرمایہ دارانہ نوعیت رکھتی ہے، لیکن اپنے خارجی سیاسی طرزِ عمل کے لحاظ سے اس میں وہ تمام مفاسد برسرِ عمل ہوتے ہیں جو سوشلسٹ تحریک کے تسلط پا جانے پر ایک جابرانہ ڈکٹیٹرشپ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ سوشلزم اور فاشزم میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے کہ دونوں کے دونوں اقتصادی اور معاشرتی زندگی پر پوری طرح حکومت کا کنٹرول قائم کرتے ہیں، دونوں کے دونوں مختارِ مطلق قسم کے مرکزی اقتدار کے متقاضی ہیں اور پھر دونوں تنقید اور اختلاف کو کچلنے میں ایک ہی جیسے ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں اور دونوں ظلم و تشدد کے طور طریقوں میں بھی مماثل ہیں۔ دونوں کو جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ صرف ایک ہے۔ یعنی فاشزم نیشنلزم پر ایمان رکھتا ہے اور قومی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے طبقاتی تقسیم اور طبقاتی جنگ کے مظاہر کو بالجبر روکتا ہے۔ لیکن سوشلزم قومی وحدت کا دشمن ہے اور طبقاتی جنگ کا داعی۔ نیز فاشزم انفرادی سرمایہ داری کو اپنے شکنجے میں کس لیتا ہے اور سوشلزم اسے مٹا دینے پر اصرار کرتا ہے۔

میں اپنی تقریر میں اس کا موقع نہیں دیکھتا کہ جرمنی اور اٹلی میں فاشزم کے نشو و نما کی تاریخ بیان کرسکوں، اس لئے مختصر طور پر اُن اصولوں اور اُن طور طریقوں کا تعارف کرانے پر اکتفا کرتا ہوں جن کو فاشزم کی تحریک اپنے ساتھ لائی ہے۔ ان اصولوں اور طور طریقوں سے آپ کا واقف ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ بدقسمتی سے خود آپ کے ملک میں ان کو آزمایا جا رہا ہے اور خطرہ ہے کہ اگر بروقت آپ ان کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوئے تو پھر یہاں ایک دوسرا جرمنی، ایک دوسرا اٹلی اور ایک دوسرا جاپان وجود میں آسکتا ہے۔

فاشزم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اقلیت اکثریت پر حکومت کرتی ہے۔ کچھ لوگ کسی وقتی ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر جائز طریقے یا ناجائز طریقے سے ایک مرتبہ برسرِ اقتدار آجانے

کے بعد پورے ملک اور پوری قوم کے خلاف ایک سازش کر لیتے ہیں اور ایک گٹھ جوڑ بنا لیتے ہیں۔ پھر اس گٹھ جوڑ کو مضبوط کرنے کے لئے اپنے گرد ایک جعلی سیاسی تنظیم بھی فراہم کر لیتے ہیں۔ پھر جب وہ اس سازش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان چند آدمیوں کی ٹولی قانون اور حکومت کے اختیارات اور دوسرے ذرائع و وسائل سے پوری قوم کو جدھر چاہتی ہے ہانکتی پھرتی ہے۔ چنانچہ ہٹلر کا نظریہ کھلم کھلا یہ تھا کہ "حکومت ہمیشہ اقلیت کرتی ہے۔" اور یہ کہ "عوام کا بھلا اسی میں ہے کہ ان کی رہنمائی چند بہترین چیدہ اشخاص کریں" اور یہ کہ "اکثریت کی حکومت کے معنی یہ ہیں کہ بہت سے بے وقوف بزدل اور کم حوصلہ آدمی چند مضبوط، قابل، بہادر اور ممتاز لوگوں کو مغلوب کر کے رکھیں۔" اسی طرح اٹلی میں فاشسٹ نظریہ کی علمی تعبیر کرتے ہوئے کہا جاتا تھا کہ "جمہوریت ایک ایسے بادشاہ کی سلطنت ہے جو بہت سے بادشاہوں سے بٹی رہتی ہے، اور یہ بہت سے بادشاہ ایک بادشاہ کی بہ نسبت زیادہ سخت گیر، زیادہ جابر اور زیادہ تباہ کار ثابت ہوتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ساتھ فاشزم کی تحریک حکمراں طاقت کو پوری طرح غیر محدود اختیارات سے مسلح کرنا چاہتی ہے اور ایک فاشی حکمران اپنے آپ کو لازماً قانون تو کیا دستور تک سے بالاتر رکھتا ہے اور دستور اور قانون کی دفعات کو اپنے مقاصد کے لئے کھلونا بنا لیتا ہے۔ مثلاً جرمنی میں ۳ر مارچ ۱۹۳۳ء کے انتخابات میں ہٹلر نے دیکھا کہ اگرچہ نازی پارٹی کے ممبر کافی تعداد میں آ گئے ہیں لیکن کمیونسٹ بھی اتنے بہرحال موجود ہیں کہ وہ دستور میں ترمیم نہ ہونے دیں گے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے ریش کا اجلاس بلاتے ہوئے کمیونسٹ ارکان کو اطلاع ہی نہیں دی گئی اور انکی عدم موجودگی میں تفویض اختیارات کا قانون Enabling Act پاس کر ڈالا جس نے ساری طاقت ہٹلر کے ہاتھوں میں منتقل کر دی۔ اس ایکٹ کی رُو سے حکومت کو قانون سازی کے غیر محدود اختیارات حاصل ہو گئے۔ دستور کی کلی یا جزئی ترمیم یا منسوخی کے اختیارات سے بھی حکمراں طاقت مسلح ہو گئی۔ علاوہ بریں حکومت لیجسلیچر کے مشورے کے بغیر معاہدات اور اعلانِ جنگ کرنے کی مجاز ٹھیرائی گئی۔ چنانچہ ۲۸ر مارچ کو دستور کی وہ دفعات جو

جرمن عوام کے بنیادی حقوق و فرائض سے متعلق تھیں، کالعدم قرار دے دی گئیں۔

ہٹلر کے بے پناہ اختیارات کا اس سے بڑا مظاہرہ کیا ہوگا کہ ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو ایک بڑے گروہ پر بغاوت کے لئے خفیہ سازش کرنے کا الزام رکھ کر بلا مقدمہ چلائے ہٹلر نے بطورِ خود اس کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی تعداد مانچسٹر گارڈین نے ۲۸۲ اور نیویارک ٹائمز نے ۱۲۰۰ بتائی ہے۔ ان میں ہٹلر کے خاص شارم ٹروپ کا سردار اعلیٰ بھی تھا اور نازی پارٹی کے پرانے وفادار ممبر بھی تھے۔ لیکن ہٹلر نے ریاض میں صاف صاف کہا کہ:

"اگر کوئی پوچھے کہ ان لوگوں پر مقدمہ کیوں نہیں چلایا گیا تو میری طرف سے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اس وقت میں جرمن قوم کی قسمت کا ذمہ دار تھا، اس لئے میں خود اپنے اندر سپریم لیگل اتھارٹی رکھتا تھا۔"

اس طریق سے جہاں کہیں بھی دستور اور قانون کھیل بن جائے، حکمراں طاقت کے مفاد کی سوئی کی حرکت کے ساتھ دستور اور قانون موم کی ناک بنا اِدھر سے اُدھر مڑتا رہے اور ایک ایک فرد کی ضرورت کے لئے قواعد بدل دیے جانے لگیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ فاشزم کے اصولوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔

فاشزم کا ایک امتیاز یہ ہے کہ حکومت اور سیاسی تنظیم کے اعلیٰ عہدے مٹھی بھر آدمیوں کی اجارہ داری میں چلے جاتے ہیں۔ بلکہ ایک آدمی کئی کئی ذمہ داریوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے اور جب کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو انہیں چند اجارہ داروں میں سے کسی کو لا کے اس جگہ کو پُر کر لیا جاتا ہے۔ ایک ہی لوگ ہوتے ہیں جو حکومت کے عہدوں اور عوامی تنظیم کی قیادت پر بیک وقت قابض ہوتے ہیں۔

فاشزم کی سازشی سیاست بغیر اس کے چل نہیں سکتی کہ پروپیگنڈہ کے پورے وسائل خصوصاً ریڈیو اور پریس حکمراں طاقت کی اپنی اجارہ داری میں رہیں۔ پریس اور ریڈیو دونوں کے ذریعے ایک طرف یہ دکھایا جاتا ہے کہ اختلاف کرنے والی کوئی طاقت اول تو سرے سے موجود نہیں ہے

اور اگر کوئی بے تو ڑی بودی، بد دیانت، اور بڑی بے اثر ہے، اور دوسری طرف ایک جعلی رائے عام کو نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے کہ ملک کی ساری فضا ہمارے ہی حق میں ہے۔ واقعات کو، خبروں کو، تقاریر کو، اعداد و شمار کو اور دلائل کو بالکل اُس شکل میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے جو حکمراں طاقت کے مفاد کے مطابق ہو۔ حقیقی دنیا کے حالات چاہے کچھ ہوں مگر پروپیگنڈا کے اسکرین پر آپ کو وہی کچھ دکھایا جائے گا جو فاشی قیادت کے حسبِ منشا ہو۔

پھر فاشزم کا خاصہ ہے کہ وہ تنقید و اختلاف کو ہر طریقے سے — قانون بنا کر بھی اور لاقانونی سے بھی — دباتا ہے، اور پوری سختی سے دباتا ہے۔ ہٹلر جب تک برسرِ اقتدار آنے کی جدوجہد میں مصروف تھا تو اس وقت تک مخالفین کو دبانے کے لئے اس کے پاس واحد قوت Storm Troops کی تھی۔ پبلک اجتماعات کے موقع پر ہٹلر کے جانباز ہلڑ مچاتے تھے اور مخالفین کو مار گراتے تھے۔ یہاں تک کہ ۹ر نومبر ۱۹۲۳ء کو اس نے چند ساتھیوں کی مدد سے بویرین گورنمنٹ کے کمشنر فان کاہر Kahr کو پکڑ کر پستول کی دھمکی سے نئی رائش گورنمنٹ کے اعلان پر مجبور کیا۔ پھر جب وہ برسرِ اقتدار آگیا تو نازی جرمنی میں گورنمنٹ کو قانوناً یہ حق حاصل تھا کہ جسے چاہے بلا وارنٹ گرفتار کر لے اور جب تک چاہے بلا مقدمہ چلائے قید رکھے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں ایک لاکھ آدمی قید خانوں اور کنسنٹریشن کیمپوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔

مخالفین کو دبانے اور اپنے حامیوں کو آگے بڑھانے کے لئے ایک طرف تو یہ کیا جاتا ہے کہ زندگی کے روزمرہ کے مسائل اور ضروریات میں سرکاری مداخلت کا دامن وسیع کیا جاتا ہے، دوسری طرف بروئے قانون ظالمانہ اختیارات حاصل کئے جاتے ہیں اور تیسری طرف اپنی حرکات کو عدالت کی حدودِ اختیار سے بالاتر رکھا جاتا ہے۔ فاشزم میں پورا عدالتی نظام عہدہ دارانِ حکومت کے اشارۂ ابرو پر کام کرتا ہے، حد یہ کہ خاص اور اہم مقدمات میں ججوں کو اوپر سے فیصلے القاء ہوتے ہیں۔ قانون کی ترازو کے باٹ بالکل کانٹے استعمال کئے جاتے ہیں۔

فاشزم کے زیر سایہ انتخاب اس طرح ہوتے ہیں کہ ظاہراً جمہوریت کی ضروری شرائط پوری ہو جائیں، لیکن اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہنگامۂ انتخاب ایک جعلی کارروائی ہوتا ہے۔ دراصل کچھ لوگ پہلے سے حکمراں طاقت کے نامزد کردہ ہوتے ہیں، جن کے حق میں سرکاری اثر ورسوخ استعمال ہوتا ہے، جن کے مخالفین کو دبانے کے لئے قانون اور نظم ونسق کی قوتیں کام کرتی ہیں، جن کا پروپیگنڈہ حکومت کے اشاروں سے پورا پریس کرتا ہے، اور جن کی کامیابی کے لئے ووٹر اس پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ لازماً انہی کو ووٹ دیں۔ دوسرے لفظوں میں عوام کے حق رائے دہی کی پوری جیب تراشی ہوتی ہے۔

پھر فاشزم کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس تحریک کی نشوونما ہمیشہ نمائشی تقریبوں اور جذباتی مظاہروں کی فضا میں ہوتی ہے۔ حکمرانوں کی سازشی ٹولی عوام پر کسی عقلی نصب العین اور علمی دلائل کے زور سے اثر انداز ہونے کے بجائے اہتمام اس امر کا کرتی ہے کہ اس کے افراد کی عظمت قائم کرنے کے لئے جگہ جگہ ان کے استقبال ہوں، ان کے سامنے خوشامدانہ ایڈریس پڑھے جائیں، ان سے ہر اسکیم کا اور ہر بڑی صنعت اور بڑے کاروبار کا، ہر ہسپتال اور ادارے کا افتتاح کرایا جائے، ان کو پارٹیاں دی جائیں، ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جائیں، پھر انکی اور ان کی بیگمات کی مختلف جلسوں اور پارٹیوں میں لی ہوئی تصاویر ہر روز اخبارات میں شائع ہوں، ان کے ناموں پر اداروں اور سڑکوں اور مجلسوں اور باغوں کے نام رکھے جائیں، ان کی تقریروں کے منتخب جملوں کو "کلمۂ طیبہ" بنایا جائے اور ان کے فرمودات فریموں میں لکھ کر آویزاں کئے جائیں اور وقتاً فوقتاً اخبارات اور تقاریر میں دہرائے جاتے رہیں اور ان کا اثر بٹھانے کے لئے کرائے کے ادیب اور صحافی اپنا پورا زور قلم صرف کر کے ان کے شاندار خاکے تیار کریں۔ اس طرح ملک کے عوام کے ذہن میں زبردستی فاشی حکمرانوں کی عظمت اتاری جاتی ہے اور ان کو محسوس کرایا جاتا ہے کہ تمہارے ملک میں یہی چند گنے چنے افراد ہیں جن پر تمہاری نگاہیں جمنی چاہئیں۔ چنانچہ نازی لیڈروں، خصوصاً ہٹلر کی تصاویر تمام سرکاری

عمارتوں اور اجتماعی اداروں اور پبلک مقامات پر جبراً آویزاں کرائی گئی تھیں اور عام نازی اپنے کوٹوں اور اپنی ٹوپیوں پر اور اپنے بٹنوں میں اس کو سجاتے تھے اور تعویذ کی طرح اس سے عقیدت رکھتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ فاشی حکمران عوام کے جذبات کو غذا دینے کے لئے بار بار قسم قسم کی تقاریب مناتے ہیں، اور ہر تقریب پر مظاہرات، فوجی نمائشوں، سلامیوں اور پریڈوں کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ مثلاً مسولینی مظاہرے کے فن کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے فاشستی انقلاب کی نمائش، روم پر چڑھائی کی سالانہ یادگار، اور پیاوے Piave پر اٹلی کی فتح کی سالانہ یادگار کی تقریب کے ذریعے عوام کو برابر اُکسایا ہے۔ یہی نہیں وہ کرسمس کے موقع پر انعامات تقسیم کرنے، بلکہ مزدوروں کو بڑھاپے کی پنشن دینے کے لئے بھی بڑی ٹھاٹھ کی تقاریب کا اہتمام کرتا تھا۔ یونیفارموں، جھنڈوں، نعروں، گیتوں اور جلوسوں کے مظاہروں کا نشہ پلا کر اس نے عوام کے جذبات کو جس طرح برسوں مسحور رکھا ہے وہ ہر فاشیت پسند طاقت کے لئے ایک قابلِ تقلید اُسوہ ہے۔

فاشزم کی تحریک اجتماعی تنظیم کے لئے جو روح فراہم کرتی ہے وہ قومی اور نسلی فوقیت کا جذبہ ہے۔ جرمنی، اٹلی، جاپان اور دوسرے تمام فاشیت زدہ ممالک میں نیشنلزم کی یہ مکروہ ترین اور متشدد ترین صورت ہی وہ طاقت تھی کہ جس نے عوام میں جذبات پیدا کئے اور ان کو کام کرنے کی ایک اجتماعی اسپرٹ دی۔ نیشنلزم کی یہ مکروہ ترین اسپرٹ اگر کسی درجے میں موجود نہ ہو تو فاشزم کو ایک اجتماعی تحریک کی حیثیت سے پروان چڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ فاشزم کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک قوم میں نسلی یا قومی تفوق کا جذبہ ابھارا جائے اور پھر قومی و نسلی عظمت کے نام پر جو مہم شروع کی جائے اس میں قومی وحدت کو ہر دوسری چیز سے اہم سمجھا جائے۔ فاشزم کسی نصب العین، کسی اصول اور کسی آئیڈیالوجی کی بنا پر اجتماعی نظم بندی کو گوارا نہیں کرتا بلکہ ایسی نظم بندی کو وہ اپنے وجود کے لئے خطرناک سمجھتا ہے۔ وہ ہر اصولی دعوت،

ہر آئیڈیالوجی اور ہر اجتماعی نصب العین کے مقابلے میں قومی وحدت کے جذباتی احساس کو لا رکھتا ہے۔ فاشزم کسی پاکیزہ سے پاکیزہ اصلاحی تحریک اور کسی اچھے سے اچھے اخلاقی نصب العین کو اس بنا پر کچل دینا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس سے قومی وحدت کو اور قومی عظمت کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہے۔ فاشزم کی نگاہ میں ایسی چیزیں انتشار اور تخریب پسندی قرار پاتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مذہب اور خدا کا بھی کوئی ایسا تصور برداشت نہیں کر سکتا جو اس کے قومی و نسلی تفوق کے جذبات کو مجروح کرنے والا ہو۔ نازیوں نے خدا کو مانا تو اس طرح مانا کہ:۔

"خدا اس قوت و حیات کا نام ہے جو جرمن نسل کے اندر حلول کئے ہوئے ہے"

اور ان میں سے جن لوگوں میں مسیح علیہ السلام سے کوئی عقیدت باقی تھی وہ اس نظریے کے ساتھ تھی کہ مسیح نارڈک اصل کے تھے۔ خود نصرانیت پر نازیوں کو یہ اعتراض تھا کہ اس میں تمام انسانوں کی برابری کا عقیدہ ہے جو جرمن نسل کی فوقیت کے خلاف ہے۔

ہر معاملے میں قوم کا نام لینا، قوم کا واسطہ دلانا، قومی مفاد پر اپیل کرنا، قومی اسپرٹ کو ابھار کر عوام میں حرکت پیدا کرنا اور قومی وحدت کے تحفظ کو ہر مقصد سے برتر سمجھنا، یہ طبعی تقاضا ہے ایک فاشی نظام کا! اور پھر اسی قومی وحدت اور قومی مفاد کو ہر اپوزیشن، ہر اختلاف اور ہر تنقید کے کچلنے کے لئے آلۂ کار بنایا جاتا ہے۔

ان سارے اصولوں اور طور طریقوں کے ساتھ ایک اور چیز جو فاشی تحریک کے مزاج میں شامل ہے وہ ذوقِ تشدد اور ذوقِ جنگ ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی فاشی نظام پایا گیا ہے اس میں داخلی طور پر اختلاف کرنے والوں کے لئے تشدد کا جذبہ اور بیرونی قوموں کے لئے نفرت اور جنگ کا جذبہ ضرور برسر عمل رہا ہے۔

اس تحریک کا حاصل اس تحریک پر مختلف قوموں نے اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا کر اس سے جو کچھ پایا ہے وہ صرف دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں بھی یہ تحریک پروان چڑھی ہے وہاں داخلی حیثیت سے اس نے فرد کو حکمرانوں کے سامنے بالکل بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ دوسرے یہ

کر بین الاقوامی حیثیت سے اس نے بھڑکتے ہوئے جنگی جذبات پیدا کیے۔ اس تحریک کے ہر تجربے کے نتائج بھی تھے اور جمہوریت اور سوشلزم کے مقابلے میں اس کے یہ نتائج بہت جلد دنیا کے سامنے آئے ہیں۔ اس نے اپنا پھل دینے میں کچھ بھی دیر نہیں کی۔ اور یہ تحریک سرمایہ دارانہ جمہوریت کے علمبرداروں کی ہمدردیاں حاصل کر سکی، نہ سوشلزم کے علمبرداروں کو حامی بنا سکی، بلکہ دونوں کی مخالفت کی چکی کے پاٹوں میں پس کر رہ گئی۔

اب فاشی نظام اپنی مکمل شکل میں دنیا کے کسی گوشے میں بھی کارفرما نہیں رہا، لیکن اس کے اصول اور طور طریقے خاص طور پر اشتراکی سلطنت میں اور اس کے علاوہ بہت سے پسماندہ ممالک میں زور شور سے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ مگر کوئی بھی عقلی طور پر ان اصولوں اور طور طریقوں کی حمایت و وکالت پر تیار نہیں ہے اور جہاں کہیں یہ طریقے استعمال کیے جاتے ہیں وہاں رائے عام ان کے خلاف زور کرتی ہے۔

مجموعی تبصرہ تہذیبِ الحاد نے اپنے آپ کو جن بڑی بڑی اجتماعی تحریکوں میں ڈھال کر پیش کیا ہے ان سب کے اصولوں سے اور ان کے مجموعی حاصل سے تعارف کرانے کے بعد اب میں چند الفاظ میں ان سب پر ایک تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

ان تحریکوں کے متعلق یہ کہنا انصاف اور دیانت کے بالکل خلاف ہوگا کہ ان میں حق اور خیر اور افادیت کا سرے سے کوئی پہلو ہی موجود نہیں ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے — دنیا میں خالص باطل اور شر اور مضرت کو کوئی ایک متنفس بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ ان تحریکوں میں بالیقین کچھ پہلو حق اور خیر اور افادیت کے موجود ہیں اور ہر ایک تحریک میں ایک جوہر ایسا ہے کہ جس کی کشش سے لوگ اس کی طرف لپکتے ہیں۔ لیکن اس جوہرِ حق و افادیت کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور اُن کے ساتھ شر اور باطل کی جتنی مقدار انسانیت کو قبول کرنی پڑتی ہے اس کی وجہ سے آخر کار لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ چنانچہ وہ جمہوریت، سوشلزم اور فاشزم میں سے ہر ایک کا تجربہ کر کے دیکھ چکے ہیں کہ ہر تحریک حق اور افادیت کے ساتھ باطل اور شر

کے اتنے وسیع پہلو رکھتی ہے کہ سودا مہنگا پڑتا ہے۔

اس مختصر سے تبصرے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا انسانیت کی معراج بس یہی ہے جہاں اس تہذیبِ الحاد نے لا کر ہم کو کھڑا کر دیا ہے؟ اور کیا واقعی ہم بس اس بات پر مجبور ہیں اسی تہذیب کی پیش کردہ تین تحریکوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کر کے لازماً اس کا دامن تھام لیں؟ اور کوئی نیا راستہ ہمارے لئے باقی نہیں ہے کہ ہم ان راستوں سے منہ موڑ کر اس طرف چل کھڑے ہوں؟ کیا ہم بالکل بے بس کر دیئے گئے ہیں کہ جمہوریت، سوشلزم، اور فاشزم کی تین دکانوں میں سے کسی ایک کا سودا ضرور خریدیں اور اس سودے میں جو بھی نفع نقصان پیش آتا ہو اسے چپ چاپ برداشت کر لیں؟

بہت سے لوگ اس سوال کا یہی جواب اپنے پاس رکھتے ہیں!

لیکن ہم اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ ہم اس تہذیب کے پیدا کردہ حالات کو انسانیت کی معراج نہیں سمجھتے۔ ہم اس کی پیش کردہ تحریکوں کو حرفِ آخر نہیں مانتے۔ ہم اپنے آپ کو اس پر مجبور نہیں پاتے کہ بے چون وچرا ان میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لیں۔ ہم تہذیبِ الحاد کی کسی ایک تحریک کو اختیار کرنے اور کسی دوسری تحریک کو رد کرنے کے بجائے اس پورے دورِ تہذیب کو رد کرتے ہیں۔ ہم ان تحریکوں کو ایک ہی خاندان قرار دیتے ہیں ——— اور ایسا خاندان کہ جس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است!" ——— ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو یہ سمجھے ہیں کہ انسان اپنی ارتقا کی آخری منزل پر آچکا ہے اور تاریخ اس منزل پر آکھڑی ہوئی ہے جس سے آگے کوئی منزل نہیں۔ اور ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو الحاد کی کسی ایک تحریک کا جھنڈا اٹھا کر اس کی کسی دوسری تحریک کے خلاف لڑ کر سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی بڑا جہاد لڑ رہے ہیں۔ ہم ان کے بخلاف یہ سمجھتے کہ تہذیبِ الحاد انسان کو بدترین پستی کے مقام پر لے آئی ہے اور ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم اس پوری تہذیب، اس کی ساری اولاد اور اس کی ساری تحریکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں۔ ہم اس پورے مجموعۂ تہذیب کو رد

کرکے اس کے خلاف نئے اصولوں پر ایک نئی تہذیب اور اس دور کے خلاف ایک نئے دور کا جھنڈا اٹھا رہے ہیں۔

آج یہ تہذیبِ الحاد اپنے سارے پتے ڈال چکی ہے اور اپنے سارے حربے چل چکی ہے اور اس کی کوکھ سے کسی نئی تحریک کے رونما ہونے کے دور دور تک کوئی آثار نہیں ہیں ___ کوئی نئی تنظیم تو کجا، اور کوئی نئی فلسفیانہ فکر تو کجا، ادب اور آرٹ کے میدان میں بھی کسی اور تحریک کی تخم ریزی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس مرغی کو جتنے انڈے دینے تھے وہ ان کو دے کر پوری طرح کڑک ہو چکی ہے۔ اب انسان اس جگہ آکھڑا ہوا ہے جہاں سے آگے چلنے سے پہلے اسے حسرت و پشیمانی کے ساتھ اپنے اس سارے سفرِ تہذیب پر ایک نگاہِ بازگشت ڈال کر دیکھنا ہے کہ اس نے کھویا کیا اور پایا کیا! یہ ٹھیک وہ لمحہ ہے کہ جو ایک نئے[1] اور پاکیزہ اسلامی دورِ تہذیب کی تاسیس کا لمحہ ہے۔

ہم اس لمحہ پر کھڑے ہو کر آج تہذیبِ الحاد کے مقابلے میں تحریکِ اسلامی کو لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ حقیر سی ابتدا اپنے سامنے ایک شاندار انتہا رکھتی ہے۔

تحریکِ اسلامی

تہذیبِ الحاد اور اس کی پیش کردہ تحریکوں کے مقابلے میں تحریکِ اسلامی کا تعارف کرانے کے لئے میں چند اہم حقیقتوں کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔

اولاً یہ کہ یہ تحریک ایک اصولی تحریک ہے۔ یہ نہ تو محدود معنوں میں کوئی مذہبی فرقہ

---

[1] "نئے" سے مراد یہ نہیں کہ اسلامی دورِ تہذیب اس سے پہلے کبھی نمودار نہیں ہوا، وہ یقیناً تاریخ میں بار بار ظہور کر چکا ہے، لیکن وہ جہاں اتنا پرانا ہے کہ جتنا انسان، وہاں وہ اپنے ہر ظہور پر اتنا ہی نیا بھی ہوتا ہے جتنا کہ کوئی اجنبی چیز ہوتی ہے۔ اس لئے اسے "نیا" اضافی حیثیت سے کہا جا رہا ہے۔

ہے اور نہ کوئی ایسی سیاسی جتھہ بندی ہے کہ جس کا مقصد کچھ افراد کو گرا کر کچھ افراد کو اوپر لانا ہو۔ بخلاف اس کے یہ ایک نظریۂ حیات، ایک نصب العین اور اپنے چند اصول رکھتی ہے جن کو یہ پرائیویٹ اور پبلک، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے ہی پہلوؤں میں غالب کرنا چاہتی ہے۔ اس تحریک کے پیش نظر کوئی جزوی اصلاحات و ترمیمات نہیں ہیں بلکہ یہ اخلاق کو بھی، سیاست کو بھی، معاشی اور معاشرتی تنظیم کو بھی، تعلیم اور ادب کو بھی، قانون اور نظم و نسق کو بھی ایک نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے۔ اس کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ یہ ایک مکمل اسٹیٹ میں ڈھل کر انسانیت کی صلاح و فلاح کا بار سنبھالے۔

ثانیاً یہ کہ اس تحریک کی نگاہ میں دنیا کے ہر بگاڑ کا حقیقی سبب خدا کا انکار اور اس کی ہدایت سے افراد اور قوموں کی بے نیازی ہے۔ اس وجہ سے یہ تحریک انسانی فلاح کے لئے بنیادی اصول یہ اختیار کرتی ہے کہ یہ دنیا جس خدا کی بنائی ہوئی ہے اور جس کے چلائے چل رہی ہے اور جو اس پر قاہرانہ تسلط رکھتا ہے اور جس کے قوانین کی بندش میں اس کے تمام اجزا جکڑے ہوئے ہیں، وہ انسان کا بھی حاکم و الٰہ ہے اور انسان اس کے سامنے بندہ و نائب کی حیثیت کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسانی زندگی کی درستی کا سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ بے چون و چرا خدا کی ہدایت اور خدا کے قانون کو تسلیم کرے جسے انبیاء و رسل کے ذریعے اس نے نازل کیا ہے۔ خدا کی مرضی اور خدا کا قانون ہی وہ سرچشمۂ ہدایت ہے کہ جس سے زندگی کے ہر شعبے کے لئے صحیح اصول اور اخلاق کی مستقل قدریں حاصل ہوتی ہیں۔ نیز یہ کہ انسان اپنی زندگی کے ہر ہر قدم پر اس خدا کے سامنے آخرت کی عدالت میں پیشی اور اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس کرے۔

ثالثاً یہ کہ یہ تحریک انسان کو ہر انسانی اقتدار سے نجات دلانے والی تحریک ہے۔ یہ ہر اس فلسفے، نظریے، اصول، قانون، قاعدے، روایت، حکومت، اقتدار اور برتری کے بندھن کو توڑ دینا چاہتی ہے جو خدا کے قانون کے تابع نہ ہو یا جو اس کے خلاف لڑتا ہو۔

ثالثاً یہ کہ یہ تحریک قوم پرستی، نسل پرستی، وطن پرستی اور طبقاتی تعصبات سے بالاتر ہے۔ اس کے سامنے کسی ایک ملک یا قوم یا نسل یا طبقے کی صلاح و فلاح کا مسئلہ نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی صلاح و فلاح کا مسئلہ ہے۔ اس کے پاس جو اصولِ حق اور اصولِ انصاف ہیں وہ جیسے ایک ملک و قوم کے لئے ہیں ویسے ہی دوسرے ملک و قوم کے لئے بھی ہیں، اس کا پیغام جیسے ایک طبقے کے لئے ہے ویسے ہی دوسرے طبقات کے لئے بھی ہے، وہ جو تبدیلیاں ایک جغرافی حد کے اِس پار چاہتی ہے وہی تبدیلیاں اس سرحد کے اُس پار بھی چاہتی ہے۔ اس تحریک کا دامن انسانیت کے کسی ایک گروہ سے بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ جو آگے بڑھ کر اسے قبول کر لے اور جو اسکی سربلندی کے لئے جدوجہد کرنے پر تیار ہو یہ تحریک اس کی اپنی تحریک ہے۔ اس کے دروازے ہر انسان کے لئے یکساں کھلے ہوئے ہیں۔

خامساً یہ کہ یہ تحریک ہر شعبۂ زندگی بلکہ پورے نظامِ تہذیب کو اُن مستقل اخلاقی قدروں پر قائم کرنا چاہتی ہے جن کی بنیادیں خود انسانی فطرت میں موجود ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ خدا کے انبیاء نے نکھار کر پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تحریک اصلاح کو باہر ہی باہر سے انسان کے اوپر لادنے کے بجائے اصلاح کو اس کے اندر سے ابھارنا چاہتی ہے۔ یہ نیا نظام اور نیا قانون ہی نہیں سامنے لاتی بلکہ تہذیب الحاد کے بنائے ہوئے انسان کے بالمقابل ایک نئے نمونے کا پاکیزہ سیرت انسان بھی برپا کرتی ہے۔ یہ انسانیت کے موجودہ خود غرض خواہش پرست، جدل پسند اور عیار نمونے کے مقابلے میں اصول پسند، حق پرست، با اخلاق، تعاون کیش، انصاف پسند، دیانت دار اور ایثار پیشہ اوصاف کا نمونۂ انسان پیش کرتی ہے۔ اس تحریک کی نگاہ میں انسانی ذہن و سیرت کو صحیح بنیادوں پر استوار کیے بغیر محض نظامِ زندگی کی کچھ خارجی تبدیلیاں بنی آدم کو وہ جنتِ امن بہم نہیں پہنچا سکتیں جس کے لئے وہ صدیوں سے مارا مارا قطع مسافت کر رہا ہے اور منزل ہے کہ دُور تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ یہ تحریک اس کی قائل ہے کہ ایک نظامِ خیر و صلاح کو چلانے کے لئے پاک سیرت کارکن درکار ہیں اور ہر اصلاح

کے لئے پاکیزہ ہاتھوں کی ضرورت ہے۔

سا دو سرا یہ کہ یہ تحریک اصلاح کے لئے اپنی ساری مہم صالح اصولوں پر چلانا چاہتی ہے اور اپنی انقلابی حرکت کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لئے اپنے اخلاقی اصولوں سے ہٹے ہوئے طریقوں کو کسی درجے میں بھی استعمال کرنے پر تیار نہیں ہے۔ تہذیب الحاد کی تحریکوں کے طریقِ کار کے بخلاف اس کا طریقِ کار بھی اتنا ہی پاکیزہ ہے جتنا کہ اس کا نصب العین۔ یہ جھوٹے پروپیگنڈے، جوڑ توڑ اور سازشوں، خفیہ تدبیروں، اور فریب کارانہ ہتھکنڈوں سے اپنی انقلابی ٹکنیک کو بالکل پاک رکھنا چاہتی ہے۔ اس کی ٹکنیک یکسر دوسری ہے۔

جمہوریت کی ایک نئی قسم | یہ تحریک ریاست کی تشکیل اور سیاسی نظام کی تعمیر کے لئے ایک بالکل جداگانہ قسم کا نقشہ اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ان کی نگاہ میں حاکمیت کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ نہ صرف تکوینی حاکمیت بلا شرکتِ غیرے اس کی ہے بلکہ تشریعی حاکمیت بھی بلا شرکتِ غیرے اسی کی ہے۔ وہ صرف ایک طبعی اقتدار (Physical Authority) ہی کا مالک نہیں، بلکہ وہی سیاسی اقتدار (Political Authority) اور آئینی اقتدار (Legal Authority) کا بھی مالک ہے۔ تحریکِ اسلامی خدا کے مقابلے میں افراد، پارلیمنٹوں، قوموں اور جمہور سب سے حاکمیت سلب کر لینا چاہتی ہے۔ وہ کسی کے لئے بھی خدا کی اطاعت اور اس کے قانون کی پابندی سے آزاد ہو کر قانون بنانے اور حکم چلانے اور اختیارات استعمال کرنے کا حق باقی نہیں رہنے دینا چاہتی۔ وہ اصل حکمران اور آخری اتھارٹی خدا کو سمجھتی ہے، اور سیاسی تنظیم کی فلاح اس کے نزدیک اس میں ہے کہ حکمران طاقت اور عوام دونوں کے حقوق و فرائض خدا کے قانون کی لکیر سے تقسیم ہوں اور دونوں کے دونوں یکساں حدود اللہ کے پابند اور خدا کی رضا کے تابع ہوں۔

اسلامی تحریک ایک ایسا اسٹیٹ چاہتی ہے جو جمہور کی خواہشات اور نظم و نسق چلانے والوں کی مفاد پرستیوں کا کھلونا نہ ہو اور جو اپنے آپ کو ہر بندش سے آزاد سمجھ کر اپنی داخلی اور

خارجی پالیسی نہ بنائے بلکہ جس میں جمہور اور ان کے سربراہ کار دونوں خداوند تعالےٰ کے بالاتر اقتدار کے تابع بن کر کام کریں۔ اس مقصد کے لئے وہ "حاکمیتِ جمہور" Popular Sovereignty کے بجائے "خلافتِ جمہور" کا نظریہ سامنے لاتی ہے۔ یعنی اسلامی ریاست کو جو سوسائٹی چلا رہی ہو وہ اپنے آپ کو مجموعی حیثیت سے خدا کا نائب سمجھے اور اس کا ہر فرد خدا کی بندگی و خلافت کے مقام پر رہ کر اپنا حصہ ادا کرے۔ خلافتِ جمہور کے نظریے کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی تحریک کی مطلوبہ "الٰہی ریاست" کا اجتماعی نظام رائے عام کی پشت پناہی سے چلے۔ عام لوگوں کی اکثریت ہی اس کے چلانے کے لئے بہترین قابلیت و اخلاق کے کارپردازوں کو منتخب کرے، عام لوگ ان کی نگرانی اور ان کا محاسبہ کرنے والے ہوں، عام لوگوں ہی کی رائے سے اس کا ارتقا ہو اور عام لوگوں ہی کے مطالبے پر اس میں تبدیلیاں واقع ہوں۔

اسلامی تحریک کا مطلوبہ اسٹیٹ اپنے قوانین اور اپنی پالیسی کی بنیاد خدا کی کتاب اور اس کے رسولوں کی سنّت پر رکھے گا۔ اس کے ہاں جو چیز پیش کی جائے گی وہ اس دلیل سے پیش کی جائے گی کہ خدا کی شریعت نے اس کا مطالبہ کیا ہے یا وہ اس کی گنجائش دیتی ہے، اور اس میں جس چیز کے خلاف آواز اٹھائی جائے گی اس دلیل سے اٹھائی جائے گی کہ خدا کی شریعت نے اس سے روکا ہے یا وہ اس کی گنجائش نہیں دیتی ہے۔

پھر اسلامی اسٹیٹ اور اس کی سیاسی تنظیم کے سامنے عوام کے مادّی مفاد کی اہمیّت کے ساتھ ساتھ اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر اخلاقی مفاد کی اہمیّت ہو گی۔ وہ مادّی مفاد کو اخلاقی مفاد کے تابع رکھے گی۔ جہاں وہ یہ محسوس کرے گی کہ کسی بڑے سے بڑے مادّی مفاد کے حصول کے لئے سوسائٹی کے اخلاقی مفاد کو بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے تو اس صورت میں وہ مادّی مفاد کو ٹھکرا دینے میں بھی تامّل نہ کرے گی۔ تحریکِ اسلامی کی نگاہ میں انسانیت کی قوت کا اصل منبع اس کا اخلاق ہے اور اگر اخلاقی قوت وصحت بحال رہے تو مادّی مفاد اور مادّی قوت خود بخود حاصل ہوتی ہے۔ ایک اسلامی ریاست کا مرکزی فریضہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی آبیاری

ہے اور اخلاقی مقاصد کی بیخ کنی!

اسلامی تحریک جس اسٹیٹ کو وجود میں لانا چاہتی ہے وہ لاحزبی شورائی نظام Non Party Parliamentary System کا متقاضی ہے۔ یہ اسٹیٹ اصولی اسٹیٹ ہونے کی وجہ سے صرف اُن لوگوں کے ذریعے سے چل سکتا ہے جو اس کے اصولوں پر پختہ ایمان رکھتے ہوئے اس کے مقاصد کے لئے مخلصانہ جذبۂ ایثار و تعاون کے ساتھ کام کریں۔ لہٰذا وہ اس امر کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا کہ اس کے چلانے والے شخصی اور طبقاتی مفاد کی بنیادوں پر جتھابندیاں کریں اور کثیر الاحزاب نظام Multi Party System کے طریق پر جوڑ توڑ اور کشمکش کے مقاصد سے ساری سوسائٹی کو گندہ کر کے رکھ دیں۔ اس ریاست کے لاحزبی نظامِ شورائی میں فرد فرد اپنے آپ کو خدا کی رضا کا تابع رکھتے ہوئے اظہار رائے کرے گا اور اپنا ووٹ استعمال کرے گا۔ آج ایک مسئلے میں وہ کسی کا حامی تھا اور کل دوسرے مسئلے میں اس کی رائے کسی اور کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

پھر اسلامی نظامِ ریاست ایک غیر قومی اور غیر نسلی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہیں جو اس کے اصول و مقاصد پر ایمان لائے۔ ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل اور ہر طبقے کا آدمی اس کے چلانے میں حصہ دار بننے کا حق رکھتا ہے۔ یہ ریاست اس لحاظ سے بھی قطعاً غیر قومی اور غیر نسلی ہے کہ یہ اپنے اصولوں کی افادیت اور اپنی برکات کو کسی خاص گروہِ انسانی کا اجارہ بنا کر رکھنا نہیں چاہتی بلکہ یہ بات عین اس کے وجود میں شامل ہے کہ یہ ہمہ تن

لہ واضح رہے کہ یک جماعتی نظام Single Party System اور لاحزبی نظام کی اصطلاحات کا مفہوم بالکل جدا جدا ہے۔ یک جماعتی نظام وہ ہوتا ہے جس میں ایک گروہ دوسرے گروہوں کو دبا کر اپنا راج چلاتا ہے۔ لیکن لاحزبی نظام میں اس طرح کی جتھابندی ہی سرے سے قابل برداشت نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موجودہ ریاستوں کو اسلامی لاحزبی نظام تک پہنچانے کے لئے پارٹی سسٹم کے ایک عبوری دور سے گذرے بغیر چارہ نہیں۔

ساری دنیا کے سامنے اپنے اصولوں کی داعی اور ایک پیغامِ اصلاح کی علمبردار ہو۔

ایک نئی معاشی تنظیم | ایک نئی سیاسی تنظیم کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریک جس نئی معاشی تنظیم کو برپا کرنا چاہتی ہے وہ ایسی متوازن اسکیم پر مبنی ہے کہ اس میں دوسری تحریکوں کے پیش کردہ مفید پہلوؤں میں سے تو کوئی بھی ساقط نہیں ہوتا لیکن ان کے خطرناک مفاسد سے وہ بالکل پاک ہے۔

وہ افراد کو پورے پورے حقوقِ ملکیت دیتی ہے اور ان کی حفاظت کرنا چاہتی ہے، لیکن یہ حقوقِ ملکیت وہ اس طرح نہیں دیتی کہ فرد کو بالکل بے لگام چھوڑ دے، بلکہ حقوقِ ملکیت کے اوپر وہ اپنی مخصوص اخلاقی پابندیاں عاید کرنا چاہتی ہے۔ وہ دولت پیدا کرنے کی، اس کو استعمال کرنے کی، کوئی پیشہ انتخاب کرنے کی، روپیہ لگانے کی، نفع کمانے کی آزادی ضرور دیتی ہے مگر ایسی اندھی آزادی دینے پر تیار نہیں ہے جو سوسائٹی اور انسانیت کے مجموعی مفاد کے لئے مہلک ہو۔ وہ اس آزادی کو اخلاقی حدود سے محدود کرتی ہے۔ وہ کمانے اور خرچ کرنے کے طور طریقوں میں سے چُن چُن کر اُن تمام چیزوں کو حرام ٹھیراتی ہے جن سے معاشرہ میں مختلف اخلاقی مفاسد ابھرتے ہیں، دوسروں کی حق تلفیاں ہوتی ہیں اور سوسائٹی کا مجموعی مفاد تباہ ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ کھلی مسابقت کا بھی موقع دیتی ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ مسابقت مساویانہ ہو اور معاشی دوڑ میں قوی کی چیرہ دستیوں سے کمزور کو بچانے کا انتظام برسرِعمل رہے۔ وہ ایسی اجارہ داریوں کو قائم نہیں رہنے دینا چاہتی جو آزاد مسابقت کو مساویانہ مسابقت نہیں رہنے دیتیں۔ پھر وہ اس مسابقت میں افراد کو اس حال میں مبتلا نہیں کر دینا چاہتی کہ بالکل نفسی نفسی کی کیفیت پیدا ہو جائے اور ہر شخص آپ اپنا ذمہ دار ہو کہ اگر وہ اس دوڑ میں گر پڑے تو اس کے سہارا دینے کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اسلامی نظامِ معشیت کا ایک بنیادی لازمہ یہ ہے کہ اس میں ایک طرف افراد کی اخلاقی اٹھان ایسی ہو کہ وہ اپنے گرنے والے ساتھیوں کو بڑھ کے سہارا دیں اور دوسری طرف ایک مرکزی ادارہ خاص اس مقصد کے لئے کام کرے کہ وہ ہر گرنے والے کو سنبھالے اور اس کو ضروری مدد دے کر از سرِ نو معاشی دوڑ میں حصہ لینے

کے قابل بناتے۔ اجتماعی انشورنس کا یہ ایک ایسا سفید سسٹم ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے نہ انفرادی آزادی پر آنچ آتی ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں

پھر اسلامی معاشی تنظیم کی اسپرٹ یہ ہے کہ وہ طبقاتی نزاع کی روک تھام کرے اور افراد اور طبقات میں باہمی تعاون پیدا کرے۔ وہ سرمایہ و محنت کو ان حالات سے نکالنا چاہتی ہے جو ان میں کشمکش پیدا کرتے ہیں اور ایسے حالات ان کو بہم پہنچانا چاہتی ہے کہ وہ باہمی تعاون کا جذبہ لے کر اپنی ریاست، سوسائٹی اور انسانیت، کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب اصول و مقاصد کا بول بالا کریں۔

اسلامی معشیت، کے اصول ریاست کی عدم مداخلت کے اس مفہوم کو قبول نہیں کرتے کہ محنت کار کو سرمایہ دار طبقوں کے بالکل رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے بلکہ وہ محنت کاروں کے حقوق کو متعین کر کے ان کا تحفظ چاہتی ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی نظامِ معشیت، کے اصول تقاضا کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کی ضمانت دے اور ضرورت مندوں کی کفالت کرے۔ اگر اس کے زیرِ سایہ کوئی فرد روٹی، کپڑے، مکان، تعلیم اور صحت کی ضروریات پوری کرنے سے محروم رہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے پورا اجتماعی نظام اور اس کے چلانے والے مجرم ہیں۔

نئی معاشرتی تنظیم | اسلامی تحریک مغربی نظامِ معاشرت کے مقابلے میں اپنی معاشرتی تنظیم کو بھی دوسرے اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ اسلامی نظامِ معاشرت کے لئے خاندان سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ خاندان نہ صرف یہ کہ انسانیت کے لئے داعیاتِ محبت و ایثار سے بھری ہوئی ایک فضا، ذہنی بحالی کے لئے ایک سکون گاہ اور اخلاقی محرکات کو جلا دینے والی ایک جنتِ جذبات فراہم کرتا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ انسانیت کے پیراہن میں مختلف نسبی اور صہری رشتوں کے ٹانکے لگانے والا ادارہ ہے، بلکہ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ نئی نسلوں کی پود کے لئے ایسی کیاریاں فراہم کرتا ہے جن کی آبیاری بڑے پاکیزہ جذبات سے ہوتی ہے اور

جن کو مضرات سے بچانے کے لئے قابلِ اعتماد انتظام ہوتا ہے۔

پس خاندان کے ادارے کو بچانے کے لئے اسلامی نظامِ معاشرت کے اصول تقاضا کرتے ہیں کہ مرد و عورت کے درمیان نکاح کے جائز راستے کو پوری طرح کھول دیا جائے اور زنا، اس کی ہر شکل، اس کے محرکات اور اس کے لئے سازگار ماحول کا کلیۃً خاتمہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اسلام نے علیحدگیٔ صنفین (Segregation of Sexes) کا اصول اور اس اصول کے تحت پردہ کا سسٹم اختیار کیا ہے۔ نیز اس نے مرد و عورت کے درمیان فرائض اور میدانِ عمل کی ایک مستقل تقسیم کر دی ہے۔ اس تقسیم کو توڑنے کے بعد پھر نہ پردہ کا سسٹم قائم رہ سکتا ہے، نہ علیحدگیٔ صنفین کا اصول کام کر سکتا ہے اور نہ پھر زنا کی روک تھام ہو سکتی ہے۔

اس معاشرتی تنظیم میں نظر بازی، زنا، برتھ کنٹرول، حرام اولاد، عشرت پسندی اور نام نہاد آرٹ اور بے حیائی کے اُس طوفان کے پھوٹ پڑنے کا کوئی امکان نہیں کہ جس کے زیرِ اثر مغرب میں انسانی اخلاق کی ساری بساط چوپٹ ہو گئی ہے۔

بین الاقوامی پروگرام اسلامی تحریک چاہے اپنا آغاز کہیں سے کر رہی ہو لیکن وہ بہر حال اپنے سامنے ایک بین الاقوامی پروگرام رکھتی ہے۔ وہ جس اسٹیٹ کی شکل میں ڈھلنے والی ہے اس کے عین وجود میں انسانیت گیر تقاضے کام کریں گے۔

لیکن یہ چونکہ قومی اسٹیٹ نہیں ہوگا، اور پھر یہ مفاد پرست اسٹیٹ بھی نہیں ہوگا، بلکہ یہ خدا پرست اور انسانیت کا خیر خواہ ہوگا، اس لئے اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ یہ دنیا کو ایک شکار گاہ سمجھ کر مکر و فریب کے جال اور قہر و جبر کے نیزہ و تلوار لے کر کمزوروں کو اپنا لقمہ بنانے نکلے۔ یہ امپیریلسٹ جذبات کے ساتھ بین الاقوامی لوٹ مار کا پروگرام بنانے والا اسٹیٹ نہیں ہو سکتا۔ بخلاف اس کے اس اسٹیٹ کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ اپنے پاکیزہ اصولوں، اپنی تہذیب کی نئی بنیادوں اور اپنے مقاصدِ انسانیت کو دنیا کی ہر قوم اور شہرِ انسانیت کے ہر شہری تک پہنچانے کے لئے اپنے ذرائع و وسائل استعمال کرے اور جس حق پر اس کی

بنیادیں قائم ہیں اس کا جھنڈا زمین کے ہر گوشے میں بلند کرے۔ پھر اسلامی تحریک کا اگر کوئی بین الاقوامی پروگرام ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو ظلم کی ہر شکل سے نجات دلائے اور خاص طور پر غلط اصولوں کی گرفت سے اور انسانی حاکمیت کے جوئے سے اسکی گردن کو آزاد کرائے۔ اس کی سعی یہ ہوگی کہ دنیا بھر میں خدا پرستی، صداقت، راستی، انصاف، شرافت و اخلاق، اور دیانت و امانت کی قدر شناس طاقتیں یکجان ہو کر خدا ناشناسی، مکر و فریب، ظلم، بداخلاقی و بے حیائی اور خیانت و دست درازی کی طاقتوں کے خلاف جدوجہد کریں۔

حضرات! یہ ہے اسلامی تحریک کا مختصر تعارف جس کو لے کر ہم اٹھے ہیں۔ نہ جانے اس قسم کی ہمہ گیر تحریک کے متعلق مدرسہ و خانقاہ کی دنیا کو یہ بدگمانی کیسے لاحق ہوئی کہ یہ کوئی ان کی حریف قوت ہے۔ یہ قوت تو اس پورے دورِ تہذیب کی حریف بن کے اٹھی ہے کہ جس کے حدود تسلط سے آج کوئی مدرسہ و خانقاہ بھی باہر نہیں۔ ہم ان حضرات کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ہماری طرف سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔

سیکولر تہذیب کی ناکامی کے بعد انسانیت مایوسی کے جس گڑھے کے قریب آپہنچی ہے اور اس کے سامنے جو خلا پیدا ہو رہا ہے اس کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ اب اسلامی تحریک میدان میں آئے۔ تاریخ انسانی میں جب کبھی اس طرح کا خلا پیدا ہوا ہے تو خدا کی تکوینی مشیت نے انسانی ہدایت کا سر و سامان کیا ہے اس لحاظ سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ تحریکِ اسلامی ٹھیک اپنے وقت پر رونما ہوئی ہے۔ یہ نہ اپنے وقت سے پہلے آئی ہے اور نہ اپنے وقت کے بعد۔ پھر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ آج پوری دنیا پر صرف دو طاقتوں کا تسلط ہے اور ان کے درمیان ہونے والی جنگ ان میں سے ایک کا عنقریب خاتمہ کر دینے والی ہے۔ پھر کیا یہ دنیا کسی ایک مفسد طاقت کی جاگیر بن کے رہ جائے گی؟ — نہیں! قرآن کا فلسفۂ تاریخ اس کے بخلاف ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ خدا نے اپنی دنیا کو کبھی کسی ایک مفسد طاقت کے بس میں نہیں دیا ہے بلکہ ہر مفسد طاقت کے استیصال کے لئے اس نے کسی نہ کسی دوسری طاقت کو اٹھایا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ہم یقین کرتے ہیں کہ آئندہ جنگِ عظیم کے بعد تاریخ میں انسانیت کی نجات کے لئے جس قوت کو ایک اہم پارٹ ادا کرنا ہے وہ تحریکِ اسلامی ہی ہو سکتی ہے۔

یہ بات بھی ایک فالِ نیک ہے کہ مختلف مسلم ممالک، جو تقلیدِ مغرب کو ذریعۂ ترقی کی حیثیت سے برسوں آزمانے کے بعد بھی، مغربی طریقوں سے زندگی نہیں پا سکے، اب ان کے اندر کا نوجوان عنصر مغرب کی فکری غلامی کا جوا گردنوں سے اتار کر اسلام کا علمبردار بن رہا ہے اور متعدد ممالک میں اسلامی تحریک کی موجیں بیک وقت اٹھنے لگی ہیں۔ یہ موجیں آگے چل کر جب باہم گلے مل جائیں گی تو یہ ایک بے پناہ تاریخی قوت میں ڈھل جائیں گی۔ یہ حالات شہادت دیتے ہیں کہ اسلامی تحریک کے لئے میدان ہموار ہو رہا ہے۔

ہم اس بات کا پورا پورا الیقین رکھتے ہیں کہ دیر صرف اتنی ہے کہ اس تحریک کو کسی ایک ملک کے باشندے دل وجان سے اپنا لیں اور اس کے اصولوں پر ایک مرتبہ پورا نظامِ حیات تعمیر کر کے دنیا کے سامنے ایک نمونہ پیش کر دیں۔ پھر نہ صرف یہ کہ مسلم ممالک، بلکہ وہ مغربی اور مشرقی ممالک بھی جہاں آج سرمایہ دارانہ جمہوریت یا سوشلزم کا دور دورہ ہے اسکے اصولوں سے مفتوح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سوال صرف یہ ہے کہ کونسا ملک ہے جو آگے بڑھ کر سب سے پہلے اس کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ اس سعادتِ عظمیٰ کا مینا سامنے رکھا ہے اور: "جو خود بڑھ کر اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے!"

ہماری دلی تمنا اور ہماری سعی یہ ہے کہ پاکستان ہی اس صبحِ سعادت کا مطلع بنے اور بظاہر حالات توقع بھی یہی ہے کہ ایک نئی تہذیبِ حق اور ایک دورِ نو کے افتتاح کا سہرا اسی خطہ کے سر بندھیگا۔ میں آپ کی خدمت میں گذارش کرونگا کہ یہ کام تو ہو کر رہنا ہے اور آپ اگر اس پر خدانخواستہ تیار نہ ہوئے تو یہ خدمت کسی اور کے ہاتھوں انجام پائے گی۔ وقت ہے کہ آپ ذمہ داری کو محسوس کریں اور خدا کے دین اور انسانیت کی اتنی بڑی خدمت کا جو موقع آپ کو مل رہا ہے اسے ضائع نہ کریں۔

آپ اگر دنیا بھر میں اسلامی تہذیب کی علمبرداری کا منصب اپنے لئے پسند کرتے ہوں تو پھر گھٹیا مقاصد پر زندگیاں نچھاور کرنے کی عادت چھوڑ دیں۔ ذرا ذرا سے فائدوں کے لئے اپنے آپ کو بیچتے پھرنا، کبھی اس جتھے کے ساتھ ہو کر اسکا جھنڈا بلند کرنا اور کبھی اُس ٹولی کے ساتھ جا کر زندہ باد کے نعرے لگانا، کبھی ایک کو پچھاڑنے کے لئے استعمال ہونا اور کبھی دوسرے کو کرسی پر بٹھانے کیلئے آلۂ کار بننا، یہ وہ ادنیٰ اور ذلیل مقاصد ہیں کہ جن میں ایمان و اخلاق اور قوتیں برباد کرنے کا نہ دنیا میں کچھ حاصل ہے، نہ آخرت میں۔ اب ان فضول کاموں کو چھوڑیئے اور اُس عظیم الشان کام میں اپنی قوتیں، اپنے مال، اپنے اوقات اور اپنی جانیں کھپایئے جسکی تکمیل میں صرف آپ ہی کی نہیں آپ کی آئندہ نسلوں کی اور آپ کیساتھ ساری دنیا کی فلاح ہے ـــــ اور پھر صرف دنیا ہی کی فلاح نہیں آپکی آخرت کی فلاح بھی اسی میں ہے! وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

برِّ صغیر ہند و پاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ

(مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)

[یہ وہ مقالہ ہے جو مولانا نے جماعت اسلامی پاکستان کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش فرمایا تھا]

ہندوستان میں اسلام کی عام حالت | یوں تو ہندوستان پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی روشنی سے منور ہو چکا تھا، اور یہ سرزمین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بابرکت قدموں سے بھی محروم نہیں رہی تھی، پر یہ بھی حقیقت ہے کہ آفتابِ اسلام کی پہلی کرنیں ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ عرب تاجر اور جہازراں، جو جنوب مغربی ساحل سے گزر کر سیلون اور جزائر شرق الہند کا رُخ کرتے تھے، ملک کے اندرونی علاقوں میں کم آتے۔ اسی طرح سندھ کا نامور فاتح محمد بن قاسم بھی اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹنے پر مجبور ہوا۔

اس ملک اور خاص کر شمالی خطے کی بدنصیبی کہیے، کہ یہ عرب فاتحوں کے دم قدم سے محروم رہا۔ ان کی جگہ، اس کے حصے میں ایسے فاتح اور کشورکشا آئے، جو خود نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یہ ترک اور مغل فاتح، اسلام بھی اُس وقت لائے جب خود اُس کے تہذیبی مرکزوں (حجاز، عراق، شام) میں انحطاط رونما ہو چکا تھا اور عباسی حکومت تو مسلم غلاموں کے ہاتھوں میں بچوں کا کھلونا بن گئی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر اسلام کے قانونِ جنگ سے ناواقف تھے اور ان کی فوج میں بڑی تعداد نومسلموں کی تھی۔

تعلیم و تربیت کے لحاظ سے حالت اور بھی خراب تھی۔ محمود غزنوی سے پہلے اُن کے ہاں مدرسوں کا رواج ہی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ درۂ خیبر سے آنے والی اکثر قومیں اسلامی تعلیمات سے اکثر بے بہرہ رہیں۔ اِن بادشاہوں اور کشورکشاؤں کے کارنامے ملک گیری اور جنگی صلاحیتوں کے لحاظ سے جو بھی قدر و قیمت رکھتے ہوں، مگر اسلامی تعلیم اور اسلامی نظامِ حکومت و عدل کے عملی مظاہرے کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص قیمت نہیں۔ بلکہ تلخ بیانی معاف، ان بادشاہوں کی عملی زندگی اور ان کے سیاسی طرزِ عمل نے اسلام کے متعلق ایسی بے شمار غلط فہمیاں پیدا کر دیں، جو ایک مدت کی مسلسل اور

پیہم کوششوں کے باوجود آج تک دُور نہیں ہوسکی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس ملک کے بڑے خطّے کے حصے میں اسلام کے ایسے پیام بر آئے جو خود اسلام کی تعلیم سے اچھی طرح واقف نہ تھے، اور تھوڑی بہت واقفیت تھی بھی، تو اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق انہیں کم ہی میسّر ہوئی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ وہ دین جو ایک عقیدہ اور ہمہ گیر نظامِ زندگی کی حیثیت سے تمام ادیان اور نظامہائے حیات پر غالب ہونے کے لیے آیا تھا، ہندوستان پہنچ کر شرک اور جاہلیت کے انبار میں دب کے رہ گیا۔ حجاز سے توحید کا جو صاف و شفاف چشمہ رواں ہوا تھا، گنگا اور جمنا کی آمیزش نے اسے گدلا کر دیا، توحیدی عقائد شرک کی آلودگیوں میں لت پت ہو گئے، اور دینِ حق کا منضبط نظامِ زندگی جاہلیت کے طور طریقوں سے بُری طرح مسخ ہوا۔

ہم یہ جانتے ہیں، اور خود اس ملک کے غیر مسلموں نے بھی اسے مانا ہے، کہ اس سرزمین پر اسلام کے بڑے احسانات ہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس سرزمین میں اسلام پر بڑے ظلم ہوتے رہے ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور یہاں اسلام قبول کرنے والوں نے اپنی کوتاہیوں کے باوجود جتنا کچھ بھی اسلام کا علم پیدا کیا اور جس قدر بھی، تھوڑا یا بہت، اس پر عمل کیا، اُس کی بدولت یہاں کے عقائد، اخلاق، تمدّن اور تہذیب میں بڑی اصلاحات رونما ہوئیں، تو اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہاں کے جو اثرات بیرونی مسلمانوں نے قبول کیے اور جو اثرات ملکی مسلمانوں میں باقی رہے، انہوں نے نہ صرف اسلامی نظامِ زندگی کو مسخ کیا بلکہ خود اسلام کے عقائد اور تصوّرات و نظریات تک میں غلط قسم کی آمیزشیں کر دیں۔ یہ وہ خرابی ہے جسے زمانہ گذشتہ میں ہر دَور کے مصلحین نے محسوس کیا ہے اور اسے دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً حضرت مجدّد الف ثانیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) کے عہد سے لے کر آج تک ساڑھے تین سو برس ہو چکے ہیں کہ اس کی اصلاح کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں، مگر اس کے باوجود صدیوں کا یہ بیٹھا ہوا زنگ پوری طرح دُور نہیں ہو سکا۔

دسویں صدی ہجری سرزمینِ ہند میں اسلام کی یہ عام حالت تھی۔ کم و بیش ہر دَور میں ہندوانہ اسلام

دل و دماغ پہ چھایا رہا۔ مگر دسویں صدی ہجری سے پہلے کفر و شرک کی یہ تاریکی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ گجرات اور سندھ کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر، جن کے تعلقات عرب ملکوں سے قائم تھے، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ تصوف کو اشراقی اور ویدانتی فلسفوں نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا، ہر طرف بدعات کی گرم بازاری تھی۔ زندگی کا کوئی شعبہ مشرکانہ اثرات سے پاک نہیں رہا تھا۔

اس زبوں حالی کی بڑی وجہ کتاب و سنت کی تعلیم سے غفلت اور بے پروائی تھی۔ اس غفلت کا بڑا سبب یہ ہے کہ شمالی ہند میں دین کی طرح علم بھی ماوراء النہر سے آیا۔ بعض اسباب کے تحت علمائے ماوراء النہر کی علمی پرواز فقہ اور اصولِ فقہ سے آگے نہیں بڑھی۔ اس لیے شمالی ہند میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ فقہ و اصولِ فقہ تک محدود رہا، اور یہاں بھی فقہاء کے فتووں کو اصلِ دین کی سی اہمیت دی جانے لگی۔ قرآن و حدیث سے بے خبری کی صورت میں ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ گجرات اور ساحلی علاقوں میں عرب ملکوں سے اہلِ علم کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے وہاں حَدَّثَنَا وَاَخْبَرَنَا کا غلغلہ بلند ہوتا رہا، مگر اس خوش نصیب علاقے میں بھی حدیث و سنت کی چہل پہل اسی وقت تک رہی جب تک شمالی ہند کا سایہ اس پر نہیں پڑا۔ بیچ کی دو صدیوں (۷۹۹ھ - ۹۸۰ھ) میں وہ مرکزی حکومت کے دباؤ سے محفوظ رہا اور علم و عمل کی خوب گرم بازاری رہی۔ جب اکبر (۹۶۳ - ۱۰۱۴ھ) نے گجرات کا صوبہ بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تو وہاں بھی وہی جہل و تاریکی لوٹ آئی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ شمالی ہند کے کان حدیث سے بالکل ناآشنا رہے۔ البتہ عرض یہ کرنا ہے کہ شیخ عبدالحق (ف ۱۰۵۲ھ)، بلکہ شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) سے پہلے اس خطے میں حدیث کا عام چرچا نہیں ہوا۔ دسویں صدی ہجری سے پہلے شمالی ہند میں صرف ایک جلیل القدر محدث حسن (ف ۶۵۰ھ) کا نام ملتا ہے۔ پھر تین صدیوں کے بعد شیخ علی متقی (ف ۹۷۵ھ) مسند درس پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان دو ناموں اور ان کے کارناموں سے شمالی ہند کے اربابِ اقتدار اور اصحابِ علم کی کوتاہیوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔

دسویں صدی ہجری تک اس برصغیر کی عام حالت یہی تھی۔ گو اللہ کی زمین نیک بندوں سے بالکل خالی بھی نہیں رہی۔ صلحائے امت انفرادی طور پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے رہے۔ بادشاہوں میں محمد تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ)، فیروز تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ)، اور سکندر لودی (۸۹۴-۹۲۳ھ) کے نام ملتے ہیں، جنہوں نے اپنی صوابدید اور ہمت کے مطابق صورت حال کے بدلنے کی کوشش کی لیکن دشواری یہ تھی کہ صحیح الفکر اہل علم کے فقدان، دین سے عام بےخبری اور خاص طور پر اسلام کے ملکی اور جنگی قانون سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بسا اوقات ایسے کام بھی کر جاتے تھے جن کی قانونِ شریعت کے اندر مشکل ہی سے گنجائش نکل سکتی ہے۔ بہر حال اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ میں ان نیک دل اور خدا ترس بادشاہوں کا ایک خاص مقام ہے جسے اسلامی تحریک کا مؤرخ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔

دسویں صدی ہجری سے پہلے کی ان اصلاحی اور تبلیغی کوششوں میں علماء کا حصہ نمایاں نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح عالم دین بہت کم تھے، اور جو تھے اُن کا بھی بڑا حصہ اپنے فرائض سے بالکل غافل تھا۔ البتہ جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے، کچھ باعمل اور خلوت نشیں صوفی ضرور تھے جو اپنی اپنی جگہ دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ اور یہ ان ہی بزرگوں کی خاموش دعوت کا اثر ہے کہ اس ملک میں اسلام کی بو باس نظر آتی ہے۔ لیکن یہ خلوت نشین اور شب زندہ دار صوفی نہ ایسے ذرائع رکھتے تھے کہ یہاں کے عوام میں اسلام کا علم وسیع پیمانے پر پھیلا سکتے، اور نہ حکومت کی مدد کے بغیر ہی ممکن تھا کہ تنہا ان کی کوششوں سے مسلمانوں کی روز افزوں آبادی بدعات اور مشرکانہ عقائد اور جاہلیت کی رسموں سے محفوظ رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ان بزرگوں کے فیضِ نظر سے داخل اسلام ہوتے تھے، وہ خود ان ہی بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا بیٹھے اور جہالت نے انہیں مرکزوں کو بدعات کی آماجگاہ بنا کر چھوڑا جہاں سے خلق خدا کو اسلام کی نعمت نصیب ہوئی تھی۔

دورِ ضلالت ۹۶۳-۱۰۱۴ھ | دسویں صدی ہجری اور اس سے پہلے جو مسلمان بادشاہ تخت

حکومت پر جلوہ افروز ہوتے وہ کم سے کم دین سے عناد نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان میں محمد تغلق اور فیروز تغلق جیسے صالح اور درد مند فرمانروا بھی ہوتے ہیں، جنہوں نے دین کی خدمت اور اصلاح حال کی اپنی سی کوشش میں کوتاہی نہیں کی۔ مُغلوں کا رنگ شروع ہی سے بدلا ہوا تھا۔ خود تیمور نے قتل وغارت میں مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ ہمایوں اپنی پریشاں حالی اور سرگشتگی کے بعد ایران سے واپس آیا تو ایسا تحفہ لے کر، جو بعد میں اسلامی ہند کا ایک پیچیدہ اور مستقل مسئلہ بن گیا۔ لیکن جس مغل بادشاہ کے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر زمین تنگ کرنے کی کوشش کی گئی اور دین وشعائر دین کی بے حرمتی میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا گیا، وہ اکبر ہے

یہ نوعمر اور ان پڑھ بادشاہ ۹۶۴ھ میں تخت وتاج کا وارث ہوا اور اس نے پورے پچاس برس حکومت کی۔ اس کے کان میں کسی شیطان نے پھونک دیا کہ "اب نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کو ہزار سال ہو رہے ہیں، دوسرے ہزار میں نئے دین اور نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ وہ پرانا دین اب کام نہیں دے سکتا" جادو کام کر گیا اور گم کردہ راہ مصاحبوں اور درباریوں کی سازش سے ایک نئے مذہب (دین الٰہی) کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک محضرنامہ پیش کیا گیا (۹۸۷ھ)، جس کا مضمون یہ تھا کہ "بادشاہ ظل اللہ ہے۔ امام عادل ہے مجتہد العصر ہے کسی کا پابند نہیں۔ اس کا حکم سب پر بالا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ اسے معصومیت کی سند دے دی گئی اور وہ آئے دن دین میں من مانی ایجادات کرنے لگا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس نے شیعہ مذہب بھی اختیار کیا تھا اور سُنّی علماء پر بڑی سختیاں کی تھیں بعض کہتے ہیں کہ وہ تصوف کی طرف مائل تھا۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ ہم اسے مذہب کے باب میں خبطی کہہ سکتے ہیں۔ آفتاب اور آگ کے سامنے سرِ عقیدت خم کرنا بھی اس سے منقول ہے۔ حضرت مریم کو معبود بنانا اور ستاروں کی پرستش بھی اس کی طرف منسوب ہے۔ اور تو اور اپنی عقل کو بھی وہ معصوم سمجھنے لگا تھا۔

اس خبط اور دماغی عدم توازن کے ساتھ اسلام اور شعائر اسلام سے اس کی نفرت بھی حد سے

زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ملازموں کو "محمد" اور "احمد" کے ناموں سے پکارا کرتا کہ دکھا کم بدبخت اہتمام نبوت کی تخفیف ہو۔ ہجری تقویم کے بدلے "الٰہی تقویم" جاری کی جس کا آغاز اس کی تخت نشینی کے سال سے کیا گیا۔ شراب اور قمار بازی کے کھلم کھلا مباح کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ گاؤ کشی بالکل بند کر دی گئی۔ مسجدیں بھی منہدم کی گئیں —— دوسری طرف غیر مسلم بیویوں کی وجہ سے قصر شاہی میں ہندو تہذیب و معاشرت کا سکہ چلنے لگا۔ ان کے لیے قصر میں خاص عبادت خانے بنائے گئے۔ بتوں کی پوجا کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ہندو تہواروں کے موقع پر عام عید منائی جاتی مختصر یہ کہ سارا ماحول ہندوانہ ہو گیا۔

فتنۂ اکبری کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس مختصر تحریر میں سرسری اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ایک چیز رہی جاتی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ دورِ اکبری کی اس گمراہی اور کج روی کا بڑا سبب "علماء سوء" ہیں۔ ان کی باہمی رقابت، مال و متاع دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی طلب، اور اس پر دین کے سطحی علم نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ یہ ان علماء سوء کی پست ہمتی، بزدلی اور دنیا طلبی ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک ایسے محضر نامہ پر دستخط کر دیے، جو حقیقت میں دین و مذہب کا "قتل نامہ" تھا۔ اس لیے یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فتنہ کی پرورش و پرداخت میں علماء سوء کا بڑا حصہ تھا۔

دورِ اکبری کے ابن حنبل، حضرت مجدد الف ثانیؒ بالکل بجا ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ہر فتورے کہ دریں زمان در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ از شومی علماء سوء است

کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوص دین اند۔ اُولٰئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ۔ اَلَآ اِنَّ

حِزْبَ الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ"

مجدد الف ثانیؒ ۹۷۱۔ ۱۰۳۴ھ | اب ہم ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اس موڑ پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے صحیح اسلامی رہنمائی شروع ہوتی ہے۔ زمین تپتی ہے تو باران رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ جب اکبری دور کی فتنہ سامانیاں حد سے بڑھ گئیں اور سچے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا، تو قدرت نے ایک درویش کو خلعت تجدید عطا فرمایا، جس نے دیوتاؤں کی اس سرزمین میں پہلی مرتبہ صحیح اسلامی رہنمائی کا علم بلند کیا، کفر و شرک کی اندھیاری میں کتاب و سنت کی شمع روشن کی، توحید

خالص کا بول بالا کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "افضل الجہاد" کی سنت زندہ کی ——— آپ سمجھے! یہ درویش کون تھا؟ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی، مجددِ الف ثانیؒ۔ اُن کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں! سچ یہ ہے کہ وہ مجدد کہے جانے کے مستحق ہیں۔ حسین بن علیؓ احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ نے اپنے اپنے زمانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، وہی خدمت اس بوریا نشین درویش نے انجام دی اور اُسی شانِ استغناء و محبوبیت کے ساتھ جو ازل سے مقربین بارگاہ کا خاصہ رہا ہے۔

مجدد صاحبؒ کی نشو و نما دسویں صدی ہجری کے اواخر میں ہوئی۔ وہ سن رشد کو پہنچتے ہی اس فتنے کے عواقب کو بھانپ گئے اور اس کے مقابلے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ دور و نزدیک ہر طرف مریدوں کا جال پھیلا دیا۔ حکومت کے افسروں اور فوج کے سپہ سالاروں پر تبلیغ شروع کر دی لیکن ان کی دعوت کے اثرات جہانگیر کے عہد حکومت میں ظاہر ہوئے، جبکہ یہ فتنہ پورے شباب پر تھا۔ اس وقت وہ کھل کر میدان میں آ گئے۔ منکرات و بدعات کی بیخ کنی میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ بے شمار مخلوقِ خدا آپ کے ہاتھوں ہدایت پذیر ہوئی۔ اوّل اوّل تو حکومت نے سختی نہ کی، مگر جب کلمۂ حق و انکشاف بلند ہوا تو جبینِ اقتدار پر شکن آ گئی۔ دربار میں طلبی ہوئی۔ مجاہد نے وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔ انسان، انسان کو سجدہ کرے، ایک موحد یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟ حضرت مجددؒ نے سرِ دربار ان بدعات و منکرات کی مذمت کی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیئے گئے۔ مگر مردِ حق آگاہ وہاں بھی اپنے کام میں مشغول رہا۔ دیکھتے دیکھتے قید خانہ کی کایا پلٹ ہو گئی۔ تب حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بادشاہ نے دعوت دی۔ ولی عہد نے استقبال کیا۔ وقت کے مصلح و مجددؒ نے ان موقعوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور دورِ اکبری کی منکرات و بدعات کی منسوخی عمل میں آ گئی اور تقریباً نصف صدی کی گھٹا ٹوپ تاریکی کے بعد ایک مرتبہ پھر اس ملک میں اسلام کو سربلندی حاصل ہوئی۔

مجدد صاحبؒ نے جن چیزوں کی طرف خاص توجہ کی، وہ یہ ہیں:-

(۱) سب سے پہلے ارکانِ حکومت کی اصلاح کی طرف توجہ کی کہ ان کے دلوں میں دعوت جگہ پیدا کر لے تو

پھر پوری قوم کا مائل ہو جانا دشوار نہیں۔ اور اس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

(۲) انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام پر اس دور میں جو مصیبتیں آئی ہیں اور آ رہی ہیں ان میں علماء سوء کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بڑا دخل ہے۔ اس لیے انہوں نے ان کی پردہ دری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور اس کے مفید نتائج ظاہر ہوئے۔

(۳) اسی طرح انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے زمانے کے صوفیہ اکثر و بیشتر ویدانت کے فلسفے اور ہندو جوگیوں کی ریاضتوں سے متاثر ہیں، اور ان کی بڑی تعداد "وحدۃ الوجود" اور "ہمہ اوست" جیسے مشرکانہ عقائد کی قائل ہو گئی ہے۔ حضرت مجددؒ نے ان جاہل صوفیوں اور ان کے گمراہ کن عقائد اور خاص کر وحدۃ الوجود کی کھلم کھلا اور بے لاگ تردید کی۔ اور یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جو اسلامی ہند کے فکری ارتقاء میں انہیں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔

(۴) عرصہ دراز سے جاہل واعظوں اور خوش عقیدہ مشائخ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ جہاں انہیں کسی بدعت پر ٹوکا گیا، وہ بدعت حسنہ کی آڑ لے کر سامنے آ گئے۔ مجدد صاحبؒ نے شاید اسلامی ہند میں پہلی مرتبہ اس کا پردہ چاک کیا۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں واشگاف طریقہ پر بار بار بیان کیا ہے کہ بدعت بدعت ہے اور اس لیے ضلالت بھی۔ اس میں حسنہ اور سیئہ کا کیا سوال؛ لَیْتَ شِعْرِیْ مِنْ اَیْنَ حَکَمُوْا بِحُسْنِ الْبِدْعَۃِ الْمُحْدَثَۃِ فِی الدِّیْنِ الْکَامِلِ۔ مجدد الف ثانیؒ کا یہ کارنامہ بھی کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ دیکھ کر مجدد صاحبؒ کے اس کارنامے کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے کہ "بدعت حسنہ" کے سلسلے میں بڑے بڑے علماء نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وحدۃ الوجود کی بے لاگ تردید اور بدعتِ حسنہ کی پردہ دری، مجدد صاحبؒ کے یہ ایسے شاندار کارنامے ہیں، جو نہ صرف اسلامی ہند بلکہ پوری اسلامی فکر کی تاریخ میں انہیں خاص مقام عطا کرتے ہیں۔

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شیخ عبدالحق دہلویؒ ۹۵۸-۱۰۵۲ھ مجدد صاحبؒ کے تجدیدی کارناموں کے ساتھ ان کے صاحبِ علم معاصر شیخ عبدالحقؒ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ان کی ذات سے شمالی ہند میں علم حدیث

کو زندگی ملی، اور سُنّتِ نبوی کا عام چرچا ہؤا۔ ہمارے نزدیک حدیثِ نبوی کی خدمت و مزاولت خود بخود دین کی روح اور مزاج سے قریب کرتی ہے۔ شیخ عبدالحق ؒ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ حدیث و سنت کی خدمت میں صرف کیا اور اس کا خزانہ عام کر دیا۔ ہم ان کا یہ احسان فراموش نہیں کر سکتے اور آج ان کی علمی و دینی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

اورنگ زیب ۱۰۶۸ - ۱۱۱۸ھ | گو جہانگیر (ف ۱۰۳۷ھ) کے آخر دورِ حکومت ہی سے مغلیہ حکومت کی پالیسی بدلنا شروع ہو گئی تھی، اور شاہ جہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۸ھ) کے دَور میں تبدیلی نمایاں ہو گئی تمدن و تہذیب کا سانچہ بدلنے لگا۔ دربار کے آداب و اطوار میں فرق آیا ـــ مگر اکبر اور اس کے درباری سالہا سال تک جس فتنۂ خبیثہ کی پرورش کرتے رہے اور ان کی پھیلائی ہوئی اخلاقی بیماریاں جس طرح سوسائٹی کے رگ و پے میں سرایت کرتی رہیں۔ ان کے دفعیہ اور بیخ کنی کے لیے ایک صاحب فہم اور اولوالعزم فرماں روا کی ضرورت باقی تھی، جو الحمدللہ کہ بوریا نشین اور گلیم پوش سلطان، عالمگیر اورنگ زیب کی تخت نشینی سے پوری ہوگئی۔ اس کی تخت نشینی کیا تھی؟ ایک مسلسل جہاد کا عزم، ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد کا آغاز! دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی جنگ صرف دو بھائیوں کی لڑائی نہ تھی۔ حقیقت میں یہ دو مختلف مکاتبِ خلق کی جنگ تھی۔ ایک اپنے پردادا کی سنت زندہ کرنا چاہتا تھا اور دوسرا اپنے پیغمبر اور ہادی کی سنت۔ سچی بات یہ ہے کہ اسلامی ہند کی کوئی تاریخ اس بوریا نشین بادشاہ کے کارناموں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ تغلق خاندان کے بعض فرمانرواؤں کو چھوڑ کر یہ پہلا اور آخری بادشاہ تھا جس نے بتوں کی اس سرزمین میں دینِ حق کی بنیادیں مضبوط کیں۔ کفر و شرک کی آلودگیوں سے اس کا دامن پاک کیا۔ حکومت اور نظمِ مملکت کے تمام شعبوں میں اسلامی آئین کی برتری قائم کرنے کی کوشش کی۔

اس موقع پر اُس نظامِ حکومت کے متعلق بھی دو حرف عرض کر دینا شاید بے محل نہ ہو جو ہندوستان کے مسلم عہد میں قائم تھا۔ ظاہر ہے کہ ان مسلمان حکومتوں میں موروثی بادشاہی کا سکہ ہی چلتا تھا جہاں فردِ واحد کو ہست و نیست کے سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس

پہلو سے یہ لوگ بھی ایک غیر اسلامی نظامِ حکومت میں بادشاہی کے منصب پر فائز تھے دوسری طرف ان کی ذاتی خدا ترسی، تقویٰ اور احساس ذمہ داری، انہیں کسی غیر اسلامی فعل سے روکتی اور قانون شریعت کے اجراء و نفاذ پر آمادہ کرتی رہتی تھیں۔ اس طرح پر ان نیک بندوں نے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے گویا دو متناقض چیزوں کے درمیان سمجھوتہ کی کوشش کی۔ اس میں یہ کہاں تک کامیاب ہوئے، تاریخ کے صفحات اس کا جواب دیں گے۔ اسلامی تحریک کی تاریخ میں بہر حال ان کا ایک مقام ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۱۱۱۴ - ۷۶ ۱۱ھ | اب ہم بارھویں صدی کے حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۱۱۸ھ میں ہوئی۔ وہ جسے ہندوستان میں "ناموس ملت کا آخری پاسبان" کہا جاتا ہے۔ اس کے جانشین ایسے کمزور اور بودے ثابت ہوئے کہ نصف صدی کے اندر اندر دیکھتے دیکھتے مغلیہ حکومت کا اقتدار جاتا رہا۔ نظم و نسق حکومت میں بالکل ابتری پیدا ہوگئی۔ ہر طرف بغاوت اور خود مختاری کا جھنڈا بلند ہونے لگا۔ مختلف صوبوں میں مقامی سیاسی طاقتیں سر اٹھانے لگیں۔ پھر ان سیاسی طاقتوں کے ساتھ مقامی تہذیبوں نے بھی بال و پر نکالنا شروع کیے، اور وہ سب بدعات اور ہندوانہ رسوم جو اورنگ زیب کی کوششوں سے دب گئے تھے، از سر نو منظر عام پر آنے لگے۔ شیعیت بھی آخری کمزور بادشاہوں کی سرپرستی میں پھر سر چڑھنے لگی۔ عام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف نہ پہلے توجہ کی گئی اور نہ اب۔ پوری قوم حکومت و امرائے حکومت کے سہارے جیتی رہی۔ جوں ہی حکومت کمزور ہوتی نظر آئی، ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ علماء اور صوفیہ کی روش میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ مدرسوں کا نظامِ تعلیم اسی پرانے ڈگر پر چلتا رہا۔ کتاب و سنت سے بے پروائی اپنے حال پر قائم رہی۔ خلاصہ یہ کہ ایک طرف چھ سات سو برس کی رچی بسی ہوئی خرابیاں تھیں۔ دوسری طرف ایک فقیر، اور ایک شہنشاہ کی کوششیں۔ اگر اورنگ زیب کے جانشین جاندار اور ہوشمند ہوتے تو شاید اصلاح و تجدید کا یہ ارتقاء جاری رہتا۔ مگر ان کی کمزوری اور نااہلی نے نقشہ ہی بدل دیا۔ حالات

بد سے بدتر ہو گئے اور پھر ایک مصلح و مجدد کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی۔

ان حالات اور اس ماحول میں شاہ ولی اللہؒ نے آنکھیں کھولیں اور سنِ رُشد کو پہنچتے ہی از سرِ نو اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے سامنے مکمل دین تھا اور اسے تمام پہلوؤں سے اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ پوری اسلامی تاریخ کا جائزہ اور غیر اسلامی افکار کی تنقیح و تنقید بھی ان کے مشن کے اہم اجزاء تھے۔ اس عظیم الشان کام کے لیے جس علم اور عزم و ہمت کی ضرورت تھی، وہ انہیں پوری طرح حاصل تھی۔ ہم ان کے کارناموں کو حسب ذیل موٹی موٹی قسموں میں بیان کر سکتے ہیں:۔

(۱) ہمایوں کے زمانے ہی سے شیعیت کا زور شروع ہو گیا تھا اور دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ شاہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفا" لکھ کر عملی طور پر یہ حجت تمام کر دی، نیز اسلامی حکومت کی خصوصیات اُجاگر کیں۔

(۲) اب تک علماء علمِ کلام ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے انہیں حدیث و فقہ کی طرف توجہ دلائی اور اسرارِ شریعت پر "حجۃ اللہ البالغہ" لکھ کر ان کے خیالات کی تصحیح کی۔

(۳) بارھویں صدی ہجری سے پہلے ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں میں قرآن کریم کی تعلیم گویا نصاب سے خارج تھی۔ انہوں نے اصولِ تفسیر میں ایک گراں قدر کتاب "الفوز الکبیر" لکھ کر کتاب اللہ کے درس و مطالعہ کی دعوت دی۔ ساتھ ساتھ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کر کے عام لوگوں کے لیے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی راہ کھول دی۔

(۴) تقلید جامد کے خلاف آواز بلند کی اور تحقیق و اجتہاد کے عملی نمونے پیش کیے۔ نیز مجتہدین کے باہمی اختلافات پر روشنی ڈالی اور ائمہ کے مختلف فیہ اقوال کے درمیان تطبیق کی کوشش کی۔ حجۃ اللہ البالغہ اور الانصاف میں اس باب کے خاص مباحث ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ذہن خود بخود کتاب و سنت کی طرف مائل ہوتا ہے اور طبیعت تقلید جامد سے اِبا کرتی ہے۔

(۵) حدیث نبوی کا خزانہ عام کرنے میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔ مؤطا امام مالکؒ

کی عربی و فارسی میں وہ شرحیں لکھیں، اور دوسری چھوٹی تصنیفات کے علاوہ اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑ گئے جن کے فیضِ علم سے ہندوستان کا چپہ چپہ "حَدَّثَنَا" اور "اَخْبَرَنَا" کے ہمہموں سے گونج اٹھا۔

صاحبزادے اور شاگرد شاہ صاحبؒ کی خوش نصیبی سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے باکمال فرزند اور شاگرد عطا فرمائے، جو ان کے بعد، ان کے مشن کی تکمیل میں لگے رہے اور پھر انہی کی تعلیم سے متاثر ہو کر اور انہی کے خاندان میں وہ سرفروش مجاہد بھی پیدا ہوئے جنہوں نے شہادتِ حق کی راہ میں اپنے جان و تن کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان کے چاروں صاحبزادے، شاہ عبدالعزیزؒ (ف ۱۲۳۹ھ)، شاہ رفیع الدینؒ (ف ۱۲۳۳ھ)، شاہ عبدالقادرؒ (ف ۱۲۳۰ھ) اور شاہ عبدالغنیؒ (ف ۱۲۲۷ھ) سب کے سب یگانۂ روزگار اور مرجعِ خواص و عوام تھے۔ ان کے دم سے ہندوستان میں کتاب و سنت کا چرچا ہوا۔ ان کی تصنیفات اب تک علماء اور طلبہ کا مرجع و ماخذ ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمۂ قرآن آج تک معیاری اور اپنی آپ مثال ہے۔ اسی طرح ان کے نواسے شاہ محمد اسحٰقؒ (ف ۱۲۶۲ھ) نے بھی ایک مدت تک مسندِ ولی اللّٰہی کی روایات قائم رکھیں اور ان کے چشمۂ علم سے عرب و عجم کے ہزاروں افراد سیراب ہوئے۔ شاہ صاحبؒ کے صاحبزادوں میں صرف چھوٹے بیٹے شاہ عبدالغنیؒ نوعمری ہی میں وفات پا گئے۔ اور اس لیے انہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح کام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ لیکن قدرت کے انداز نرالے ہیں۔ اُن کے صُلب سے وہ یگانۂ روزگار مجاہد پیدا ہوا جس نے دادا کے ادھورے کام کی تکمیل کی اور اسلامی ہند کی تاریخ پر ایسا نشان چھوڑ گیا جو رہتی دنیا تک مٹ نہیں سکتا۔ آگے کی سطروں میں ان کے کارناموں کی طرف ضروری اشارے آتے ہیں۔

شہیدؒ اب تو یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی ہند میں اصلاح و تجدید کی ابتدا حضرت مجدد سرہندیؒ سے ہوئی۔ شاہ صاحبؒ نے ان سے آگے بڑھ کر ایک مکمل فکری و علمی تجدید و انقلاب کی داغ بیل ڈالی، لیکن خود وہ انقلاب برپا نہ کر سکے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ ذہنوں کی صفائی اور افکار و نظریات کی تنقیح و تنقید میں بسر ہوا۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ قوموں کی تاریخ میں ایسا ہوتا آیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ان سے تعلق رکھنے والوں اور خود ان اُنہی کے خاندان میں، ایسے اللہ کے بندے نکل آتے جنہوں نے ان کے مشن کی تکمیل کی۔ دعوت حق کا پرچم بلند کیا اور اس سرزمین میں پہلی مرتبہ اقامتِ دین کی تحریک برپا کی۔ میری مراد سیّد شہید بریلویؒ (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ) اور ان کے جاں نثار رفیق مولانا اسماعیل شہیدؒ (۱۱۹۳-۱۲۴۶ھ) سے ہے۔ حق یہ ہے کہ ان شہیدانِ راہ حق اور ان کے ماننے والوں اور ان کے نقشِ قدم پر گھربار لٹانے والوں نے اس ملک میں ایک بار عہدِ صحابہؓ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کا مقصد اللہ کے دین کو غالب کرنا اور اُس کی شریعت کو اُس کی زمین پر نافذ کرنا تھا۔ اور اس مقصدِ عظیم کے لیے انہوں نے ہر ممکن قربانی کی۔ بنگال سے لے کر سرحد اور ماوراء سرحد تک، زمین کا چپہ چپہ ان کی قربانیوں اور خدا کاریوں پر گواہ ہے۔ چرخِ کج رفتار ان شہیدانِ راہِ حق کے کارناموں کو بھلانا بھی چاہے تو کیسے بھلائے؟

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اس تحریکِ تجدید وجہاد کے بارے میں اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک تھی جو صحیح اسلامی نصب العین کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی اور آخر دم تک اپنے مقصد پر قائم رہی۔ اس کی برکت اور اس کے علم برداروں کے دم قدم سے توحید و سنت کا جو بول بالا ہوا اور بدعات و مشرکانہ رسوم کا جس طرح استیصال ہوا، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ آج اس برصغیر ہند و پاکستان میں ایمان و عمل کی جو ٹوٹی پھوٹی متاع پائی جاتی ہے وہ انہی مردانِ حق کا فیض ہے اور انہی کے آفتابِ علم و عمل کا پرتو۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ مشہد بالاکوٹ کے بعد یہ تحریک ختم ہوگئی۔ اور اب تو یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں کہ سیّد صاحبؒ کی شہادت، یعنی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک سید شہیدؒ کے ماننے والے اور اس تحریک سے وابستگی رکھنے والے پوری طرح سرگرمِ عمل رہے اور برطانوی پولیس اور فوج کی تمام چنگیز سامانیوں کے باوجود اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء ابھی سید صاحبؒ کی تحریک ملک کے اندر اور باہر منظم طریقہ پر جاری تھی کہ ۱۸۵۷ء کا وہ خونیں انقلاب رونما ہوا جس نے اس ملک کی کایا ہی پلٹ دی۔ مسلمان اس مہم میں آگے آگے تھے اور حکومت انہی کے ہاتھوں سے گئی تھی، اس لیے وہی اس انقلاب کا خاص طور پر شکار ہوئے۔ بدیسی حاکموں نے انہیں سیاسی اور معاشی طور پر ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور طرح طرح کی آزمائشوں اور مشکلات میں ڈال کر ان کا وجود و عدم برابر کرنے کی کوشش کی۔

دینی حیثیت سے بھی اس انقلاب کے نتائج کم خطرناک نہیں ثابت ہوئے۔ وہ قوم، جو ہمیشہ حکومتوں کے سہارے جیتی رہی اور جس کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا کبھی کوئی باقاعدہ انتظام نہیں کیا گیا، اور جس کے ذمہ دار اور مرفہ الحال طبقے کی بنیادی کمزوریاں پچھلی صدی کی کشمکش میں پوری طرح ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس سے یہ توقع ہی کب تھی، کہ وہ انقلاب اور اس کے خطرناک نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے گی؟ نتیجہ ظاہر تھا۔ ایک افراتفری پیدا ہوئی۔ ایک طرف سے "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نعرہ بلند ہوا۔ فرنگیت نوازی کا یہ نعرہ زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں رہا۔ تعلیم و تربیت سے لے کر مذہب و اخلاق تک سب اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ہمیں یہاں خاص طور پر دینی افکار سے بحث ہے۔ سرسید اور اس کے ہمنواؤں نے اس سلسلے میں جو غلطیاں کیں، آج تک ان کی تلافی نہیں ہو سکی۔ سیاسی مرعوبیت نے ان کے دل و دماغ ماؤف کر دیئے تھے۔ وہ ہر چیز کو مفتوحانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کی تبلیغ و تحریر سے دین کے باب میں ایک شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہوئی، جس کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ایک محدود طبقے میں اب بھی باقی ہیں۔

سید احمد خاں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کی بنیاد رکھی، اور دوسری طرف اس شکست خوردہ ذہنیت کے ردّ عمل کے طور پر دیوبند کی درس گاہ قائم ہوئی۔ علی گڈھ اور دیوبند میں صرف دو درسگاہوں کی بنیادیں نہیں رکھی گئیں، بلکہ دو متضاد اور مختلف مکاتب فکر کے مستقل مرکز قائم ہوئے۔ ایک نے مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے آگاہ کر کے اگر ایک مفید کام کیا، تو اس کے ساتھ ان کو مغرب کی ذہنی غلامی اور ذہنی تقلید کا روگ بھی لگا دیا۔ دوسرے نے مسلمانوں کی

علمی اور دینی میراث کو بچا کر اگر ایک اہم خدمت انجام دی، تو اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کے موروثی جمود کو بھی برقرار رکھنے کا مرتکب ہوا، اور اس نے دنیا اور زمانے کی ضروریات سے گویا آنکھیں بند کر لیں۔ یہ کشمکش صرف دیوبند اور علی گڑھ، دو مقامات تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ جہاں کہیں بھی نئے اسکول اور کالج قائم ہوئے، انہوں نے سرسید کی پالیسی کو اپنی مشعلِ راہ بنایا، اور اسی طرح ملک کے جس حصے میں بھی کوئی مدرسہ قائم ہوا، عام جمود اور مسائل حیات سے فرار کی پالیسی میں اس کی روش دیوبند ہی کے نقشِ قدم پر رہی۔

یہ کشمکش عرصے تک چلتی رہی، تا آنکہ دونوں قسم کی درس گاہوں سے ایک بڑی تعداد لکھ پڑھ کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی، اور اہل فکر و نظر کو احساس ہوا کہ اگر اس خلیج کو پاٹنے کی فوری کوشش نہ کی گئی، تو اسلامی ہند بالکل دو متضاد اور مخالف کیمپوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا اور کسی متحدہ جدوجہد کے شروع کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔

اس احساس نے ندوۃ العلماء کی شکل اختیار کی۔ لکھنؤ میں اس کا دارالعلوم قائم ہوا، اور نصابِ تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ طالب علم علوم دین اور عربی زبان و ادب میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیا اور اس کے مسائل سے بھی بے خبر نہ رہے۔ آگے چل کر اس نے دیوبند اور علی گڑھ کی انتہا پسندیوں کے درمیان ایک بین بین مسلکِ اعتدال کی شکل اختیار کر لی۔ اور ملک کے طول و عرض میں ایسی درس گاہیں قائم ہوئیں جو اس کے طریقۂ تعلیم و اصلاح سے متاثر تھیں، اور ایسے اہل علم اور اہل قلم تو شمار میں نہیں آسکتے، جو اس کے لٹریچر سے متاثر، فکری اور ذہنی طور پر اس سے قریب اور اس کے تہذیبی رجحان سے ہم آہنگ کہے جا سکتے ہیں۔ ندوہ کی ایک اور خصوصیت ہے ــــ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے عربی زبان و ادب کی اہمیت پر زور دے کر اس نے عرب ملکوں سے اپنے تعلقات استوار کیے اور اس کے فارغ التحصیل طلبہ نے ان ملکوں کے مسائل سے ماہرانہ واقفیت بہم پہنچائی اور اپنے ملک کے حالات و مسائل سے ان ملکوں کو روشناس کرایا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ پچھلے دور میں جب کبھی اسلامی ہند کو دنیائے اسلام اور خاص کر عرب ملکوں سے رشتۂ الفت استوار

کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، اسی درسگاہ کے تربیت یافتہ کام آتے ہیں، اور آئندہ بھی غالباً یہی اس کام میں آگے ہوں۔

نئے مفکرین | یہ تین مکاتبِ فکر بیسویں صدی کے ابتدائی حصے تک یہاں پوری طرح پھیلے رہے۔ اُدھر مسلمان ملکوں میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑنے لگی۔ سید جمال الدینؒ افغانی انتقال کر چکے تھے (ف ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء)۔ لیکن ان کے افکار و خیالات زندہ تھے۔ سلطان عبدالحمید معزول ہو چکا تھا۔ مگر اس کے ان تحریک پروپیگنڈے کے اثر سے مسلمانانِ عالم کو عثمانی حکومت سے خاصی وابستگی ہو گئی تھی۔ ترکی انقلاب کے بعد ہی طرابلس اور بلقان میں جنگ اور بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھے اور پھر پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہوتے مسلمانانِ ہند کی محبوب ترکی حکومت برطانیہ و فرانس اور روس کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑی۔

ان بین الاقوامی حالات کا ہندوستان میں اسلامی فکر کی نشوونما اور ارتقاء پر گہرا اثر پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں جاندار سیاسی تحریکیں اُٹھیں۔ قدرتی طور پر نئے رجحانات کی قیادت اور نئے افکار کی تربیت و پرورش کے لیے دو نئے مفکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ ایک نے نثر کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور دوسرے نے نظم کو۔ ایک نے کتاب و سنّت کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ دوسرے نے اسلام کی باطنی روح کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی میری مراد ابوالکلام اور اقبالؒ سے ہے۔ ابوالکلام کا یہ دَورِ دعوت و جہاد ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء بلکہ اس کے کچھ بعد تک قائم رہا۔ اور اس دوران میں اُن کے خطبوں اور مقالات سے ہزاروں اور لاکھوں آدمی نہ صرف متأثر ہوئے، بلکہ اُن کی زندگیاں بدل گئیں، ان کے سوچنے اور سمجھنے کے سانچے تبدیل ہو گئے۔ مگر آہ! کہ جس نے اپنی غیر معمولی شخصیت اور معجز نما تحریر و تقریر سے لاکھوں نیند کے ماتوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، اور ہزاروں دلوں میں ایمان کی تخم ریزی کی، آہستہ آہستہ خود فکر و عمل کے اس مقام پر پہنچ گیا، جہاں مخلص سے مخلص عقیدت مند کے لیے بھی اُس کے قول و فعل کی توجیہہ مشکل ہو گئی۔

اس کے برخلاف اقبالؒ کی روش یکساں اور ان کا فکری ارتقا مسلسل جاری رہا۔ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے جو فکر و نظریے کر وہ آئے تھے، اس میں برابر جلا ہوتی رہی، اور حلقۂ فیض و استفادہ بڑھتا ہی گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں اقبالؒ کے فکر و نظر اور ان کی تصنیفات سے اسلامی فکر کی تشکیل و پرداخت میں بڑی مدد ملی ہے۔ اور اپنی عمر کے آخری سالوں میں "قادیانیت" کے خلاف ان کا جہاد تو اسلامی ہند کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

سیاسی تحریکوں کا اثر | طرابلس و بلقان کے ۔۔ ح فرسا حادثات سے لے کر تحریک خلافت تک مسلمانانِ ہند میں جو سیاسی بیداری اور فداکاری کا جذبہ پیدا ہوا، اس کا بھی اسلامی فکر و تحریک پر اچھا اثر پڑا۔ ان تحریکوں میں جو لوگ آئے، وہ قلب و جسم ہر لحاظ سے مسلمان ہو کر آئے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سوچنے سمجھنے کے طریقے بدل گئے۔ ان خلافتی لیڈروں کے لیڈر مولانا محمد علی جوہر تھے اللہ ان کی تربت پر غفران و رحمت کے پھول برسائے، دورِ حاضر کے سیاست کاروں میں وہ ایک فردِ فرید تھے جن کا دل اسلام کی سچی محبت سے معمور تھا، اور جن کا معیارِ ردّ و قبول اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں تھا جب تک ان کے ہاتھوں میں زمامِ قیادت رہی مسلمانوں کی سیاسی گاڑی اگر اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں، تو کم از کم اسلامی طرز پر چلتی رہی۔ لیکن یہ تبدیلی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے نظامِ خلافت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل کر دیا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال (اتاترک)، اور امان اللہ خاں کی تجدد نوازیوں سے ہمارے ہاں کے مغرب پرست طبقے کو شہ ملی۔ دوسری طرف علمائے کرام یا تو سیاست سے کوسوں دُور چلے گئے تھے یا تحریک خلافت کے زمانے سے سیاست میں دخیل ہوئے تو اپنے بنیادی فرائض کو بھی بھول گئے۔ اور پھر یہ کہ میدانِ سیاست کے شعبدہ بازوں میں جو ایک مردِ مومن تھا، وہ دنیا کے غم و آلام سے چُور، ۵۲ سال کی عُمر ہی میں اپنے مالک و آقا کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ (۱۹۳۱ء) ؎

خاکِ قدس اورا بہ آغوشِ تمنا در گرفت
سُوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت (اقبالؒ)

اب تک بے عملی تھی، بدعقیدگی نہیں تھی۔ لیکن حالات سازگار پا کر فکری بغاوت نے بھی سر اٹھایا یہ ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے۔ اس فکری بغاوت کی علمبرداری لکھنؤ کے رسالہ نگار کے حصے میں آئی۔ ساتھ ساتھ انکارِ حدیث کا فتنہ بھی نئے لباس میں ظاہر ہوا۔ اس "مولودِ خبیث" کی پرورش بھی ابتداءً نیازی کے نگارخانے میں ہوئی۔ پھر اسے امرتسر میں موافق آب و ہوا نصیب ہوئی اور اس کے بعد دہلی کے ایوانِ حکومت میں اسے مستقل مامن مل گیا۔ جو اب تقسیم کے بعد پاکستان کے سکرٹریٹ میں منتقل ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے جامعہ ملیہ دہلی کے ایک استاذ (جو ماشاء اللہ خاندانی اہلِ حدیث اور ایک مشہور اہلِ حدیث عالم کی یادگار ہیں) عرصے سے اس کے سرپرست بنے ہوئے ہیں۔ فتنۂ نگار اور فتنۂ انکارِ حدیث کی بیخ کنی کے سلسلے میں جن بزرگوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور سالہا سال تک سنتِ نبوی کے دفاع اور تحفظ کے لیے سینہ سپر رہے، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ممتاز و نمایاں ہیں۔

تحریک خلافت کے اثر سے جو مذہبی بیداری پیدا ہوئی تھی، اس کی عمر بہت تھوڑی ثابت ہوئی۔ وہ ایک جذباتی تحریک تھی اور کسی واضح فکر سے محروم۔ اس لیے جوں ہی وہ مخصوص نفسیاتی حالات بدلے، عارضی دینداری بھی ختم ہو گئی اور مذہبی بغاوت کی روح جاگ اٹھی، جیسا کہ ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

اتنے میں ملک کے سیاسی حالات تیزی کے ساتھ بدلنے لگے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگرس، جس میں آزادی پسند ہندو اور مسلمان سب جمع تھے دیکھتے دیکھتے ہندو قوم پرستی کی علمبردار بنتی چلی گئی اور اس کے اس رویے سے مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ان میں سے ایک گروہ کانگرس کی اس روش کے باوجود اس سے چمٹا رہا اور اس نے متحدہ قومیت کا ایک نیا نظریہ اختیار کر لیا۔ دوسرا گروہ پہلے مسلم کانفرنس اور پھر مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے "مسلم قومیت" کا علمبردار بنا۔ دونوں گروہوں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ متحدہ قومیت کے ماننے والے ایک بے میل مشترک تہذیب اور مشترک قومیت کے

گن گاتے تھے، جس کے نتیجے میں وطن پرستی کا جذبہ زور پکڑ رہا تھا اور اکبری دور کی ہندوانہ جاہلیت کی طرف مسلمانوں کے پھر پلٹ جانے کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔ دوسری طرف مسلم قومیت کے علم بردار مسلم تہذیب اور مسلم نسل و قومیت کی بنیاد پر ایک نئی تحریک اٹھا رہے تھے، جس میں بظاہر تو اسلام سے وابستگی کا ایک خوشگوار رجحان پایا جاتا تھا، مگر اس کی رفتار صاف بتا رہی تھی کہ یہ تحریک اسلام کی آئیڈیالوجی کی طرف جانے کے بجائے تیزی کے ساتھ ترکی، ایران اور مصر کی طرح محض ایک آزاد مسلم قوم وجود میں لانے کی طرف جا رہی ہے۔ وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی یہ کشمکش دن بدن بڑھتی چلی گئی اور مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ ہے کہ علمائِ دین کی نمائندہ "جمعیت" نیشنل کانگرس اور اس کی پالیسی کے پرجوش ہم نواؤں میں شامل ہو گئی اور شدت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم قومیت کی نوخیز تحریک، جس کی لیڈر شپ میں دین کے علم اور دینی رجحانات کی پہلے ہی بہت کمی تھی، علماء سے برسرِ جنگ ہو گئی اور اس چیز نے صرف علماء ہی کا استخفاف نہیں کرایا۔ بلکہ ان کے ساتھ علم دین اور دین کے اثر کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔

وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی یہ آویزش جانے کہاں جا کر دم لیتی، اگر اس کے خلاف اسلام اور دین حق کی بے لاگ آواز بلند نہ ہو جاتی۔ ایک دردمند صاحبِ علم نے آنے والے حالات کا بروقت اندازہ لگا لیا تھا، اور ۱۹۳۳ء میں حیدر آباد دکن سے رسالہ ترجمان القرآن جاری کر کے دعوتِ حق کے لیے زمین ہموار کرنا شروع کر دی تھی۔ ابتدائی چار پانچ سال افکار و خیالات کی تنقیح اور اسلامی فکر و دین کے متعلق گوناگوں غلط فہمیوں کے ازالے میں صرف ہوئے۔ ابھی یہ تنقید و تنقیح کا کام جاری تھا کہ ۳۸-۱۹۳۷ء میں ہندوستانی وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی کشمکش طوفانی شکل اختیار کرنے لگی اور وقت آگیا کہ اسلام کی سچی اور بے میل دعوت ایک مرتبہ پھر دنیا کے سامنے پیش کر دی جائے۔ اس موقع پر مدیر "ترجمان" نے پہلے ہندوستانی وطن پرستی کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور آج صرف موافق ہی نہیں، مخالف بھی یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اگر ترجمان القرآن

کے بے پناہ مقالات نہ ہوتے تو متحدہ قومیت کا جنازہ نکلنا آسان نہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی قومیت کے خلاف ترجمان القرآن کے مسلسل حملوں سے مسلم لیگ اور مسلم قومیت کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی اور ان مضامین کو گھر گھر پھیلانے میں لیگی حضرات نے پورا تعاون کیا۔ مگر جوں ہی اس مہم کی دوسری منزل سامنے آئی اور مدیر ترجمان القرآن نے مسلم قومیت کی کمزوریاں اور اس کے علم برداروں کی بے اعتدالیاں دکھانا شروع کیں اور اسلام کی راہ راست سے ان کا انحراف، عام مسلمانوں پر واضح کیا، تو پھر اس غریب سے زیادہ بُرا کوئی نہ تھا، گویا اسلام سے محبت نہیں، اپنی قومیت اور عادات و رسم و رواج زیادہ محبوب ہیں۔ جب تک شرک خالص کی مذمت کی جائے سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کے نعرے بلند ہوں، اور جہاں ان جاہلی رسوم اور عادات کی نشان دہی کی جائے جو اسلامی سوسائٹی میں راہ پاگئی ہیں، تو جبینِ ناز پر شکنیں پڑ پڑ جائیں۔ یہ طالبانِ حق کا شیوہ نہیں، یہ تو بگڑی ہوئی قوموں کے لچھن ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مدیر ترجمان القرآن نے ہندوستانی قومیت کی بیخ کنی سے فارغ ہوتے ہی فوراً اپنی کوششوں کا رُخ صاف اور بے لاگ اسلام کی دعوت کی طرف موڑ دیا، تاکہ مسلم قومیت کی تحریک کو اتاترکی اور رضا شاہی کی طرف جانے سے روکا جائے اور مسلمانوں میں زندگی کی جو نئی حرکت پیدا ہوئی ہے، اُسے اقامت دین کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ یہ کوئی نئی دعوت نہ تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاءؑ اسی کی دعوت دیتے آئے ہیں اور ان کے بعد امت کے تمام مصلحین کے پیش نظر یہی چیز رہی ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کی بے لاگ دعوت کا خود اس کے دم بھرنے والوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے استقبال نہیں کیا ہے۔ یہ کل کا واقعہ ہے، اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے یہ نیرنگیاں ظہور میں آ رہی ہیں۔ اس لیے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک مدیر ترجمان القرآن انفرادی طور پر اللہ کے دین کی طرف

بلاتے رہے اور اقامت دین کی منظم جدوجہد کے لیے لوگوں کو آمادہ عمل کرتے رہے۔ جن نیک اور باہمت بندوں نے پہلے پہل اس دعوت کا خیر مقدم کیا اور صدائے لبیک بلند کی، انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اپنے کو ایک "اسلامی جماعت" کی صورت میں منظم کر لیا۔ اور مدیر ترجمان القرآن بالاتفاق اس کے امیر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلسل جدوجہد اور دعوت کی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ صحیح معنوں میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ دوسری اسلامی تحریک تھی جو صحیح لائنوں پر شروع کی گئی۔ اس کے نصب العین، طریق کار اور پروگرام پر خاصہ لٹریچر موجود ہے جسے پڑھ کر اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس جماعت نے پوری کوشش کی کہ مسلمان اقامت دین کے نصب العین پر جمع ہو جائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مسلم قوم پرستی اور ہندو وطن پرستی کی کشمکش اپنی راہ پر بڑھتی رہی اور اس کا انجام برصغیر ہند کے اندر دو نئے ملکوں کی پیدائش میں رونما ہوا۔ ایک بھارت جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا گیا اور وہاں کے مسلمان پوری طرح مغلوب ہو گئے۔ دوسرے پاکستان جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا اور سابق ہندوستانی مسلم قوم کے نصف سے کچھ زائد حصے کو یہ اختیارات حاصل ہو گئے کہ اگر وہ اسلام کو زندہ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اس تقسیم کے بعد اسلامی تحریک کی علم بردار جماعت بھی تقسیم ہو گئی۔ اس کے جو کارکن تقسیم کے وقت بھارت میں تھے، وہ ایک الگ جماعت بن گئے، اور آج جس تن دہی اور ثابت قدمی کے ساتھ انتہائی نامساعد حالات میں وہ دعوت حق کا فرض انجام دے رہے ہیں، وہ ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے قابل رشک ہے۔ اللہ کی شان کہ جو علمائے دین بڑے بڑے آستانوں کے مسند نشیں ہیں، ان کی آنکھیں تو متحدہ قومیت کے بدترین نتائج دیکھنے اور بھگت لینے کے بعد بھی نہ کھلیں، بلکہ وہ اس سے بھی بڑھ کر ایک شدید تر ضلالت، یعنی لادینی (سیکولرزم) کے حامی بن گئے، مگر جن لوگوں کے سر کسی دارالعلوم

کی دستارِ فضیلت سے مزین نہیں ہیں، وہ آج بھی سرزمین ہند میں وطن پرستی اور سیکولرزم کی تردید کر رہے ہیں اور نظامِ حق کے قیام کی دعوت دیئے جا رہے ہیں۔ پھر اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ دینی آستانوں کے مسند نشینوں کو ان سرفروش بندگانِ حق کی جرأتیں دیکھ کر شرم تو کیا آتی، وہ آج اُلٹے اس بات پر تُلے ہوئے ہیں کہ اُس ایک آواز کو بھی بند کر دیں جو بھارت میں حق کے لیے بلند ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کے بلند ہونے سے انہیں اپنی مذہبی ساکھ کے گر جانے کا اندیشہ ہے۔ تاریخ میں یہ عجوبہ بھی یادگار رہے گا۔ کہ متحدہ قومیت اور لادینی جمہوریت کے علمبردار تو قرار پاتے ہیں ٹکسالی مسلمان، اور ان کے دارالافتاؤں سے گمراہی اور بے دینی کے فتوے جاری ہو رہے ہیں اُن لوگوں کے حق میں جو آج اِس انتہائی خطرناک دور میں بھی بھارت کی مسلم اور غیر مسلم آبادی کو اسلامی نظامِ زندگی کی طرف دعوت دینے سے نہیں چوکتے۔

یہ تو ہے بھارت کی اسلامی تحریک کا حال۔ رہا پاکستان، تو یہاں تقسیم کے بعد "جماعت اسلامی پاکستان" کے نام سے ایک الگ نظام جماعت بن گیا۔ اور اس نے حال و مقام کی مناسبت سے ایک دوسرا پروگرام اختیار کیا۔ یہاں ایک مسلم قوم آباد ہے اور اسے حاکمانہ اختیارات حاصل ہیں اس لیے یہاں کی جماعت نے تقسیم کے بعد تارکانِ وطن اور پناہ گزینوں کی امداد و خدمت کے کام سے فارغ ہوتے ہی مطالبۂ نظامِ اسلامی کی مہم شروع کر دی، جو اربابِ اقتدار کی تمام ناراضگیوں کے باوجود جاری رہی اور آخر اس مطالبہ کی مہم نے انہیں قرارداد مقاصد پاس کرنے پر مجبور کیا، جو اصل میں اس ریاست کے مسلمان ہونے کا باضابطہ اعلان تھا۔

قراردادِ مقاصد کے بعد جماعت کا کام دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طرف وہ عام دعوت اور منظم تبلیغ و تلقین سے معاشرے کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کرنے میں لگی ہوئی ہے، تاکہ اسلامی قانون کے نفاذ و اجراء کے لیے مناسب و موزوں فضا تیار ہو۔ دوسری طرف وہ قراردادِ مقاصد کے منشاء کے مطابق نظامِ حکومت کی اصلاح کے لیے کوشش کر رہی ہے، تاکہ حکومت کا دستور بھی اسلامی ہو اور ملک کا قانون بھی اسلامی۔ اور پھر اس پر عملدرآمد کرنے کے لیے ایسے لوگ ملک میں برسرِ اقتدار

آئیں جن کی ذہنیت اور سیرت بھی اسلامی ہو۔ اس کام میں جو طبقے جماعت اسلامی کی مزاحمت کر رہے ہیں، ان میں سے مغرب زدہ طبقے کی مزاحمت ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ اسلامی نظام کا قیام ان کے ملحدانہ نظریات اور ان کی فاسقانہ عادات کے خلاف ہے۔ اشتراکی گروہ کی مزاحمت بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ جہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ جاری ہوگا، وہاں مارکس اور لینن کا طریقہ جاری نہ ہو سکے گا۔ گمراہ فرقوں کی مزاحمت بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اس کے فروغ کا امکان اسی وقت تک ہے جب تک یہاں کتاب و سنت سے بے نیاز ہو کر کام کرنے والی ایک فاسق قیادت موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی مزاحمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو وہ ان علماء کرام کی مزاحمت ہے جو خود کہتے ہیں کہ شریعت کی فرمانروائی انہیں مطلوب ہے، خود کہتے ہیں کہ فسق و فجور کا یہ طوفان انہیں گوارا نہیں ہے، مگر جب اسی مقصد کے لیے جماعت اسلامی آگے بڑھ کر جد و جہد کرتی ہے تو وہ ہر ممکن طریقہ سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ساری ہمدردیاں اس فاسق قیادت کے ساتھ ہوتی ہیں جو یہاں اس وقت ہر ضلالت اور ہر فسق کی پشت پناہ بنی ہوئی ہے۔ اس طرز عمل کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے۔ مگر ہمیں اس کا کوئی جواب معلوم نہیں ہے۔ شاید یہ راز اس دنیا میں راز ہی رہے گا، مگر ایک دن بہرحال آتا ہے جس میں سارے ہی رازوں سے پردہ اٹھ جائے گا۔

یَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ؏

رسائل و مسائل

تصوّف اور تصوّرِ شیخ

سوال:- میں نے پورے اخلاص و دیانت کے ساتھ آپ کی دعوت کا مطالعہ کیا ہے۔ باوجود سلفی المشرب ہونے کے آپ کی تحریکِ اسلامی کا اپنے آپ کو ادنیٰ خادم اور ہمدرد تصور کرتا ہوں اور اپنی بساط بھر اسے پھیلانے کی جدوجہد کرتا ہوں۔ حال میں چند چیزیں تصوف اور تصورِ شیخ سے متعلق نظر سے گذریں جنہیں پڑھ کر میرے دل و دماغ میں چند شکوک پیدا ہوئے ہیں۔ آپ بھی بدعات کو مباح قرار دے رہے ہیں حالانکہ اب تک کا سارا لٹریچر ان کے خلاف برسرِ احتجاج رہا ہے۔ جبکہ ہماری دعوت کا محور ہی فریضۂ اقامتِ دین ہے تو اگر ہم نے خدانخواستہ کسی بدعت کو انگیز کیا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ساری بدعات کو تحریک میں گھس آنے کا موقع دے دیا گیا۔ آپ براہ کرم میری ان معروضات پر غور کر کے بتلائیے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں تصوف اور تصورِ شیخ کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں اور فی نفسہٖ یہ مسلک کیا ہے۔ امید ہے کہ ترجمان میں پوری وضاحت کر کے مشکور فرمائیں گے۔

جواب:- آپ کو میرے کسی ایک فقرے سے جو شبہات لاحق ہو گئے ہیں وہ کبھی پیدا نہ ہوتے اگر اس مسئلے کے متعلق میرے دوسرے واضح بیانات آپ کی نگاہ میں ہوتے۔ بہرحال اب میں واضح الفاظ میں آپ کے سوالات کا مختصر جواب عرض کیے دیتا ہوں۔

(۱) تصوف کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے، بلکہ بہت سی مختلف چیزیں اس نام سے موسوم ہو گئی ہیں جس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں وہ اور چیز ہے۔ جس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں وہ ایک دوسری

چیز، اور جس تصوف کی ہم اصلاح چاہتے ہیں وہ ایک تیسری چیز۔

ایک تصوف وہ ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیہ میں پایا جاتا تھا، مثلاً فضیل بن عیاض، ابراہیم ادھم، معروف کرخی وغیرہم، رحمہم اللہ۔ اس کا کوئی الگ فلسفہ نہ تھا، اس کا کوئی الگ طریقہ نہ تھا، وہی افکار اور وہی اشغال و اعمال تھے جو کتاب و سنت سے ماخوذ تھے، اور ان سب کا وہی مقصود تھا جو اسلام کا مقصود ہے یعنی اخلاص للہ اور توجہ الی اللہ، وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ۔ اس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں اور صرف تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ اس کو زندہ اور شائع کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرا تصوف وہ ہے جس میں اشراقی اور رواقی اور زردشتی اور ویدانتی فلسفوں کی آمیزش ہو گئی ہے، جس میں عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کے طریقے شامل ہو گئے ہیں، جس میں مشرکانہ تخیلات و اعمال تک خلط ملط ہو گئے ہیں، جس میں شریعت اور طریقت اور معرفت الگ الگ چیزیں ——— ایک دوسرے سے کم و بیش بے تعلق، بلکہ بسا اوقات باہم متضاد ——— بن گئی ہیں، اور جس میں انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے فرائض کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے کے بجائے اس سے بالکل مختلف، دوسرے ہی کاموں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک اس کو مٹانا خدا کے دین کو قائم کرنے کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جاہلیتِ جدیدہ کو مٹانا۔

ان دونوں کے علاوہ ایک اور تصوف بھی ہے جس میں کچھ خصوصیات پہلی قسم کے تصوف کی اور کچھ خصوصیات دوسری قسم کے تصوف کی ملی جلی پائی جاتی ہیں۔ اس تصوف کے طریقوں کو متعدد ایسے بزرگوں نے مرتب کیا ہے جو صاحبِ علم تھے، نیک نیت تھے، مگر اپنے دور کی خصوصیات اور پچھلے ادوار کے اثرات سے بالکل محفوظ بھی نہ تھے۔ انہوں نے اسلام کے اصلی تصوف کو سمجھنے اور اُس کے طریقوں کو جاہلی تصوف کی آلودگیوں سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اس کے باوجود ان کے نظریات میں کچھ نہ کچھ اثرات جاہلی فلسفۂ تصوف کے، اور ان کے اعمال و اشغال میں کچھ نہ کچھ اثرات باہر سے پیدا ہوئے اعمال و اشغال کے باقی رہ گئے، جن کے بارے میں ان کو یہ

اشتباہ پیش آیا کہ یہ چیزیں کتاب و سنت کی تعلیم سے متصادم نہیں ہیں، یا کم از کم تاویل سے انہیں غیر متصادم سمجھا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں اس تصوف کے مقاصد اور نتائج بھی اسلام کے مقصد اور اس کے مطلوبہ نتائج سے کم و بیش مختلف ہیں۔ نہ اس کا مقصد واضح طور پر انسان کو فرائض خلافت کی ادائیگی کے لیے تیار کرنا اور وہ چیز بنانا ہے جسے قرآن نے لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کے الفاظ میں بیان کیا ہے، اور نہ اس کا نتیجہ ہی یہ ہو سکا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ایسے آدمی تیار ہوتے جو دین کے پورے تصور کو سمجھتے اور اس کی اقامت کی فکر انہیں لاحق ہوتی اور وہ اس کام کو انجام دینے کے اہل بھی ہوتے۔ اس تیسری قسم کے تصوف کی نہ ہم کلی تصدیق کرتے ہیں، اور نہ کلی تردید۔ بلکہ اس کے پیروؤں اور حامیوں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ براہِ کرم بڑی بڑی شخصیتوں کی عقیدت کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے آپ اس تصوف پر کتاب و سنت کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالیں اور اسے درست کرنے کی کوشش کریں۔ نیز جو شخص اس تصوف کی کسی چیز سے اس بنا پر اختلاف کرے کہ وہ اسے کتاب و سنت کے خلاف پاتا ہے، تو قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی رائے سے موافقت کریں یا مخالفت، بہر حال اس کے حقِ تنقید کا انکار نہ فرمائیں اور اسے خواہ مخواہ نشانۂ ملامت نہ بنانے لگیں۔

(۲) تصورِ شیخ کے بارے میں میرا موقف یہ ہے کہ اس پر دو حیثیتوں سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ایک بجائے خود ایک فعل ہونے کی حیثیت، دوسرے ایک ذریعۂ تقرب الی اللہ ہونے کی حیثیت۔

پہلی حیثیت میں اس فعل کے صرف جائز یا ناجائز ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے، اور اس کے فیصلے کا انحصار اس پر ہے کہ آدمی کس نیت سے یہ فعل کرتا ہے؟ ایک نیت وہ ہے جس کی تشریح حکیم عبدالرشید محمود صاحب نے اپنے مضمون میں کی تھی۔ اس نیت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے حرام کہنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ دوسری نیت وہ ہے جس کی تشریح مولانا ظفر احمد صاحب نے کی۔ اس نیت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ مشکل ہے کہ کوئی فقیہ اسے ناجائز کہہ سکے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے میں کسی شخص کو کسی اجنبیہ کے حسن کا نظارہ کرتے ہوئے دیکھوں اور اس حرکت کی غرض دریافت کرنے پر

وہ مجھے بتلائے کہ میں اپنے ذوقِ جمال کو تسکین دے رہا ہوں تو ظاہر ہے کہ مجھے کہنا پڑے گا کہ تو یقیناً ایک ناجائز کام کر رہا ہے۔ دوسرے کو یہی حرکت کرتے دیکھوں اور میرے پوچھنے پر وہ مجھے جواب دے کہ میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ اس صورت میں مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ تیرا یہ فعل ناجائز نہیں ہے اس لیے کہ وہ اپنے فعل کی ایک ایسی وجہ بیان کر رہا ہے جسے شرعاً میں غلط نہیں کہہ سکتا۔

اب رہی اس تصورِ شیخ کی دوسری حیثیت، تو مجھے اس امر میں نہ کبھی شک رہا ہے اور نہ آج شک ہے کہ اس حیثیت سے یہ فعل قطعی غلط ہے خواہ اس کی نسبت کیسے ہی بڑے لوگوں کی طرف کی گئی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ سے تعلق پیدا کرنے اور بڑھانے کے ذرائع بتانے میں خود اللہ اور اس کے رسول نے ہرگز کوئی کوتاہی نہیں کی ہے پھر کیوں ہم ان کے بتلائے ہوئے ذرائع پر قناعت نہ کریں اور ایسے ذرائع ایجاد کرنے لگیں جو بجائے خود بھی مخدوش ہوں اور جن کے اندر خاصی بے احتیاط آدمی کو قطعی اور صریح ضلالتوں کی طرف لے جا سکتی ہو؟

اس معاملہ میں یہ بحث پیدا کرنا اصولاً غلط ہے کہ جب دوسرے تمام معاملات میں ہم مقاصدِ شریعت کو حاصل کرنے کے لیے وہ ذرائع اختیار کرنے کے مجاز ہیں جو مباحات کے قبیل سے ہوں تو آخر تزکیۂ نفس اور تقرب الی اللہ کے معاملہ میں ہم کیوں انہیں اختیار کرنے کے مجاز نہ ہوں؟ یہ استدلال اصولاً اس لیے غلط ہے کہ دین کے دو شعبے ایک دوسرے سے الگ نوعیت رکھتے ہیں۔ ایک شعبہ تعلق باللہ کا ہے، اور دوسرا شعبہ تعلق بالناس وغیرہ کا۔ پہلے شعبے کا اصول یہ ہے کہ اس میں ہم کو انہی عبادات اور انہی طریقوں پر انحصار کرنا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول نے بتا دیے ہیں، ان میں کوئی کمی کرنے، یا ان پر کسی نئی چیز کا اضافہ کرنے کا ہمیں حق نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کی معرفت، اور اس کے ساتھ تعلق جوڑنے کے ذرائع کی معرفت کا ہمارے پاس کوئی دوسرا ذریعہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے سوا نہیں ہے۔ اس معاملہ میں جو کمی یا بیشی بھی کی جائے گی وہ بدعت ہوگی، اور ہر بدعت ضلالت ہے۔ یہاں یہ اصول نہیں چل سکتا کہ جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔ یہاں تو قیاس سے بھی اگر کوئی مسئلہ نکالا جائے گا تو لازماً اس کا کوئی مبنیٰ کتاب و سنت میں موجود ہونا چاہیے۔ بخلاف

اس کے دوسرے شعبے میں مباحات کا باب کھلا ہوا ہے۔ جو حکم دے دیا گیا ہے اس میں حکم کی اطاعت کیجیے، جو کچھ منع کیا گیا ہے اس سے رک جائیے، اور جس معاملہ میں حکم نہیں دیا گیا ہے اُس میں، اگر کسی ملتے جلتے معاملے پر کوئی حکم ملتا ہو تو اس پر قیاس کر لیجیے، یا قیاس کا بھی موقع نہ ہو تو اسلام کے اصولِ عامّہ کے تحت مباحات میں سے جس چیز اور جس طریقے کو نظامِ اسلامی کے مزاج سے مطابق پائیے اسے قبول کر لیجیے۔ اِس شعبے میں یہ آزادی ہمیں اس لیے دی گئی ہے کہ دنیا اور انسان اور دنیوی معاملات کے متعلق مصلحت کو جاننے کے عقلی اور علمی ذرائع کم از کم اس حد تک ہمیں ضرور حاصل ہیں کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی رہنمائی سے مستفید ہونے کے بعد ہم خیر کو شر سے اور صحیح کو غلط سے ممیز کر سکتے ہیں۔ پس یہ آزادی صرف اسی شعبے تک محدود رہنی چاہیے۔ اِسے پہلے شعبے تک وسیع کر کے، اور جو کچھ ممنوع نہیں ہے اسے مباح سمجھ کر، تعلق باللہ کے معاملہ میں نئے نئے طریقے نکالنا یا دوسروں سے اخذ کر کے اختیار کر لینا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اسی غلطی میں مبتلا ہو کر نصاریٰ نے رہبانیت ایجاد کر لی تھی جس کی قرآن میں مذمت کی گئی۔

اعلان

مرکزِ جماعت اسلامی پاکستان سے مراسلت کرنے والے حضرات سے

ضروری التماس

جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی دفاتر اور دفتر رسالہ ترجمان القرآن سے خط و کتابت کرنے والے حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مکمل پتہ اور پتے میں "اچھرہ" کا لفظ ضرور لکھا کریں۔ کیونکہ شہر لاہور کے دوسرے ڈاک خانوں سے الگ، اچھرہ ایک مستقل ڈاکخانہ ہے اور پتے میں اچھرہ کی تصریح اگر نہ ہو تو ڈاک کے مؤخر یا غلط تقسیم ہو جانے کا احتمال ہو جاتا ہے۔

قیم جماعت

تفہیمات حصہ دوم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا اب پیش کی جا رہی ہے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اہمیت حاصل ہے، محتاج بیان نہیں۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ہے۔ کر رہا ہے، اور کرتا رہے گا۔ انشاءاللہ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس میں جن اہم اور معرکۃالارا مسائل پر گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ
- ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
- ڈارون کا نظریہ ارتقا
- لباس کا مسئلہ
- غلامی کا مسئلہ
- نماز میں آلہ مکبر الصوت کا استعمال

ضخامت ($\frac{20\times26}{8}$) ۴۳۶ صفحات قیمت سات روپے صرف

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

سروورق ریبن پرنٹنگ پریس، بل روڈ، لاہور میں چھپا